جُنونِ وَہوش

جوش ملسیانی

لالہ لبھا رام مینیجر نے مفید عام پریس واقع نکلسن روڈ دہلی میں چھاپا اور
لالہ موتی رام مینیجر نے منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز دہلی و الہ آباد شائع کیا۔

جُنونُ وہوش

جوش ملسیانی

پبلشرز
منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمٹیڈ
نکلسن روڈ۔ دہلی

قیمت چار روپلے

بار اوّل 1946

فہرست

مقدّمہ

(ہری چند اختر ایم۔اے)

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ کپور تھلے کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ لاہور اور دیگر مقامات سے کئی نامور شاعر آئے تھے۔ صدارت کے لئے شیخ سر عبدالقادر مرحوم سے درخواست کی گئی تھی۔ اُنھوں نے آتے ہی پوچھا "جوش صاحب آگئے؟" مشاعرے کے مہتمم مولوی ظفر حسین صاحب اشک نے بتایا کہ جوش صاحب نے کسی اور مصروفیت کے باعث معذوری کا اظہار کیا ہے۔ شیخ صاحب نے فرمایا "حیرت ہے کہ یہاں جوش ملسیانی کے بغیر بھی کوئی مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا اُستاد اس علاقے میں موجود ہے اور آپ اُسی کو نہیں بُلا سکے!" اشک ایسا موقع شناس بھلا اس صورتِ حال سے کیوں نہ فائدہ اُٹھاتا؟ فوراً تجویز پیش کر دی کہ اجازت ہو تو آپ کی طرف سے پیغام بھیج دیا جائے! چنانچہ ایک خاص ایلچی موٹر کار میں نکودر روانہ ہو گیا۔

اُس وقت جو شاعر شریکِ محفل تھے اُن میں سے کئی ایک کو اپنے علم و کمال اور مقبولیت و شہرت کی بنا پر اُستادی کا درجہ حاصل تھا اور دو چار حضرات ایسے بھی تھے جن کی "حفظِ عزّت" کی فکر نازک مزاجی کی مناسب حدود سے تجاوز کر چکی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ سر عبدالقادر کی طرف سے جوش صاحب کی اتنی "شدید تعریف" اور خلوص بھرے اشتیاق پر کسی ایک پیشانی پر بھی بل نہیں آیا۔ اور پھر جب مشاعرہ کے اختتام کے قریب جناب جوش تشریف لائے تو ان سب کے چہروں سے حقیقی مسرّت کا اظہار ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے اس سے پہلے جوش کو نہیں دیکھا تھا انھیں کچھ دیر کے لئے ضرور حیرت ہوئی ہو گی، درمیانے قد کا

ایک سیدھا سادہ ادھیڑ آدمی۔ معمولی کپڑے کی پگڑی قمیص اور دھوتی۔ دیسی جوتا۔ لباس کی وضع قطع خالص دیہاتی۔ شاعرانہ بناوٹ نہ استادانہ تمکنت۔ کوئی نقیب نہ حاشیہ بردار۔ سراپا خلوص و انکسار۔ انداز میں دیہاتیوں کی سی اخلاص بھری سادگی اور بے تکلفی۔ ہونٹوں پر ہلکا سا متانت آمیز تبسم۔ صورت شکل اور لباس کو دیکھو تو زیادہ سے زیادہ ایک سفید پوش عامی کہ سکیں۔ ہر شخص سے یوں ملتا ہے جیسے خود اُسے بھی اپنے مرتبے کا علم یا احساس نہیں۔ بھلا اس وضع قطع اور انداز میں ناواقف لوگوں کو اس اشتیاق اور تعریف و توصیف کا جواز کہاں نظر آسکتا تھا۔ جس کا اظہار سر عبدالقادر نے فرمایا تھا؛

لیکن انھیں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مشاعرہ قریب الاختتام تھا۔ دو چار شاعر باقی رہ گئے تھے۔ وہ پڑھ چکے تو جوش صاحب سے درخواست کی گئی۔ یہ مشاعرہ مسلم الثبوت اساتذہ اور مشہور و مقبول شعراء کی تعداد کے علاوہ کلام کی بلندی اور عمدگی کے اعتبار سے بھی ایک معیاری اجتماع تھا۔ ایک ہی محفل میں اس پایہ کا اتنا کلام آج کل تو کجا اُن دنوں بھی بہت کم سُننے میں آتا تھا۔ پس اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب جوش صاحب شعر پڑھنے کے لئے اُٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سامعین نہ صرف داد و توصیف کے الفاظ کا ذخیرہ ختم کر چکے ہیں بلکہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگاتے لگاتے خود بھی شل ہو گئے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ آنے والے شاعر کی وضع قطع بھی کچھ توقع خیز نہ تھی لیکن آپ نے ایک رباعی ہی پڑھی تھی کہ سب دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور غزل شروع ہونے تک تو مشاعرے میں گویا ایک نئی رُوح ایک نیا جوش اور اس کے ساتھ ایک نئی قوّت پیدا ہو گئی۔ اب وہ سیدھا سادہ مسکین صورت اور منکسر المزاج شاعر مملکتِ سخن کا پُر جلال و صاحبِ سطوت بادشاہ نظر آ رہا تھا۔ دیہاتی سادگی کا مُنحنی سا مجسمہ نیستانِ شعر میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح گونج رہا تھا۔ ایک قصباتی اسکول کا مدرّس پروازِ تخیّل اور کمالِ فن کے وہ کرشمے دکھا رہا تھا کہ بڑے بڑے اُستاد بے خودی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ پنجاب کا ایک دیہاتی کوثر

میں ڈھلی ہوئی ٹکسالی زبان میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہا تھا جس پر دہلی اور لکھنؤ والے بھی رشک کریں

جن لوگوں کو پہلے حیرت ہوئی تھی وہ اور بھی زیادہ حیرت زدہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ پہلے ان کی حیرت شک و شبہ پر مبنی تھی اور اب اُس سے مرعوبیت اور احترام کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن خود شاعر اس صورت حال سے قطعاً متاثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عام سامعین کے علاوہ باکمال شاعروں اور عالی مرتبت اُستادوں نے بھی بڑی فراخ دلی سے خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ صاحب فن اہل نظر کی تعریف و توصیف سے فن کار کو قدرتی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ جوش صاحب بھی مسرور و مطمئن تھے۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کسی حرکت کسی انداز میں کامیابی کے نشے۔ فتح مندی کے غرور یا مقابلے کی خواہش کا شائبہ تک نہیں۔ تحسین و آفریں کے غلغلوں میں غزل ختم کرکے پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آبیٹھے۔ جیسے ایک فرض تھا وہ ادا ہو گیا اور بس۔ اقلیم سخن کا جلالت مآب پھر وہی مسکین صورت سادہ مزاج دہاتی تھا۔ گونجنے والا شیر پھر خلوص و انکسار کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والا قادر الکلام پھر ایک عامی کی طرح سیدھے سادے چھوٹے چھوٹے بے تکلف جملوں میں باتیں کر رہا تھا۔

یہ مغالطہ اور تعجب تو خیر ناواقف ظاہر بینوں تک محدود تھا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ جس ماحول میں جوش صاحب کی تربیت و پرورش ہوئی اور جن حالات میں ان کی زندگی گزری اُن کا پورا علم ہونے پر جوش صاحب کے شاعرانہ کمالات اُن لوگوں کو بھی ایک معجزہ معلوم ہوں گے جو انھیں ایک مدّت سے جانتے اور اُن کے کلام اور مرتبے کو پہچانتے ہیں۔ پنڈت لبھو رام صاحب جوش یکم فروری ۱۸۸۸ء کو ضلع جالندھر (پنجاب) کے قصبہ ملسیاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُنھوں نے بیٹے کی تعلیم اور کنبے

کی گزر اوقات کے لئے کوئی اثاثہ نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے نہایت غریبی اور تنگ دستی سے بسر ہونے لگی۔ ۱۴ برس کے بے یار و مددگار یتیم کے کمزور کندھوں پر جن مختلف اور کثیر التعداد ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑا تھا اُن کے تصوّر ہی سے جی چھوٹنے لگتا ہے۔

اس بے کسی اور اقتصادی مشکلات و مصائب کے علاوہ جوش صاحب کو ماحول بھی سخت غیر شاعرانہ نصیب ہوا۔ بتیس تینتیس سال کی عمر تک ملسیان میں رہے جسے صرف پنڈت جی کے لحاظ سے قصبہ کہ دیا گیا ہے پھر ۱۹۱۲ء سے نکودر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ ملسیان سے ۸ میل کے فاصلے پر تحصیل کا صدر مقام ہے نکودر کو اگرچہ بعد میں ہائی اسکول نصیب ہو گیا جس میں پنڈت جی فارسی کے اوّل مدرّس تھے۔ لیکن جوش صاحب کے زمانۂ طالب علمی میں آپ کے وطن اور آس پاس کے مقامات میں نہ تو تعلیم و تعلّم کا کچھ قابلِ ذکر چرچا تھا نہ کسی فردِ واحد کو علم و فن میں کوئی امتیازی شان حاصل تھی اور نہ اُن کے ہم صحبت اور ہم جماعت طلبہ میں کسی کو شعر و سخن کا ذوق تھا۔ یہ علاقہ کافی زرخیز سمجھا جاتا ہے اور مردم خیز بھی۔ لیکن علم و ادب اور شعر و شاعری کے ساتھ جوش صاحب سے پہلے اسے کوئی مناسبت نہیں رہی۔ زرعی پیداوار کی صورت میں یہاں کی زمین سونا اور لعل اُگلتی رہی ہوگی۔ زندگی کے شعبوں میں اس خاک سے بڑے بڑے آدمی اُٹھے ہوں گے لیکن اس کے کسی کھنڈر کسی خرابے سے کبھی کسی شاعر یا ادیب کی ہڈی تک برآمد نہیں ہوئی۔ جن لوگوں سے جوش صاحب کو سابقہ پڑتا تھا۔ جن کی صحبت میں ان کا وقت گزرتا تھا۔ جن کی بات چیت اور دل چسپیوں میں انھیں شامل ہونا پڑتا تھا ان کی سرگرمیوں میں شاعری و زبان دانی اور ادب و انشا کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ اسی طرح کسبِ علم و فن اور وسعتِ مطالعہ کے اسباب اور سہولتیں بھی عنقا تھیں

بس ایسے حوصلہ کُش حالات۔ ادب کُش ماحول اور ادیب کُش ذمہ داریوں کے باوجود ایک بے سہارا پریشان حال یتیم اگر ایک لائق فائق معلّم ایک ممتاز و مستند ادیب اور ایک باکمال صاحب فن شاعر بن جائے تو اسے معجزہ کے سوا کیا کہا جائے گا۔

اب جوش صاحب کی شاعری کی جگہ اُن کی ذات زیر بحث آگئی ہے تو چند اور باتیں بھی بیان کردوں۔ ان کا طالب علمی کا زمانہ مالی اعتبار سے جتنا مصیبت ناک تھا تعلیمی ترقی کے لحاظ سے اتنا ہی خوش گوار رہا۔ حافظے کی قوّت بچپن ہی سے زبردست تھی اور قدرت نے ذہن ایسا اچھا عطا کیا تھا کہ درسی کتابوں سے پہلوتہی کی ضرورت پیش نہ آتی تھی بڑے مشکل سے مشکل سبق دو چار بار نظر ڈالنے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ محنت شاقہ سے کام نہ لیتے تھے۔ اور اس طرح دوسری ذمہ داریوں پر توجہ کے لئے وقت نکل آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود جماعت میں اوّل نمبر پر رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے۔ امتحان کے دن تھے۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد سایکالوجی کے چالیس صفحے دیکھے اور دس بجتے بجتے سو گئے۔ صبح اُٹھ کر ایک ہم سبق سے کہا کہ ذرا فلاں حصّہ کتاب سے میرا امتحان لو۔ وہ سوال پوچھتا گیا اور یہ اُن ہی الفاظ میں درست اور معقول جواب دیتے گئے۔ جو کتاب میں درج تھے۔ اس طرح آپ ادیب فاضل اور منشی فاضل بن گئے۔ اگرچہ اب ان جماعتوں کے پڑھانے والے جوش صاحب سے برسوں استفادہ کر سکتے ہیں لیکن اس وقت روز افزوں ذمہ داریوں میں گھرے ہوئے پریشان حال نوجوان کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی بالخصوص اس وجہ سے کہ اس سے آپ کے "روزگار" کی سبیل بن گئی اور آپ اردو فارسی کے معلّم اور پھر اوّل مدرس ہو گئے۔

مزاج کی سادگی اور بے تکلّفی کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ سادگی زندگی کے کسی ایک پہلو تک محدود

نہیں بلکہ ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ لباس کی یہ حالت ہے کہ معمولی کپڑے کی سفید گپڑی سفید دھوتی اور سفید قمیص کو کافی سمجھتے ہیں اور عام طور پر اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ سردیوں میں البتہ کمّل اوڑھ لیتے ہیں۔ گلوبند۔ کالر، نکٹائی اور پتلون کا تو ذکر ہی کیا کوٹ پاجامے کو بھی دفتری وردی کہا کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھار موسم کے اعزاز میں معمولی سیدھا سادہ کوٹ پاجامہ بھی پہن لیتے ہیں۔ جرّابوں کے زیادہ سے زیادہ دو جوڑے جاڑے کے لئے کافی ہیں۔ وہ بھی سفر میں استعمال ہوتے ہیں۔ بوٹ آج تک نہیں پہنا۔ سر عبدالقادر نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "اتنی سادگی اس رنگینیِ کلام سے کچھ بھی مطابقت نہیں رکھتی"۔ لیکن جوش صاحب کی رائے یہ ہے کہ؎

کیف آور تو ہے شراب فقط / ساغرِ زرنگار کیا معنی ؟

کھانے پینے میں بھی تکلّف کو قطعاً دخل نہیں۔ جو کچھ ملا خدا کا شکر کر کے کھا پی لیا۔ بعض لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ شعر و سخن کی محفلوں میں کیف و مستی سے بھری ہوئی شراب کے خم کے خم لنڈھانے والے جوش نے عمر بھر کبھی شراب نہیں پی بلکہ گوشت سے بھی ہمیشہ پرہیز کیا۔ اس کے باوجود احباب کی محفلوں میں نہایت بے تکلّفی سے شامل ہوتے اور بلبل کی طرح چہکتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں؎

آتا ہے جذبِ دل کو وہ اندازِ مے کشی / رندوں میں رند بھی رہیں دامن بھی تر نہ ہو

لیکن اس اندازِ مے کشی کو ہر شخص کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ حالات و طبائع کے مطابق نسخے میں تغیّر و تبدّل بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جناب شیخ کی جسمانی حالت اور منزلِ مقصود کے پیشِ نظر مشورہ دیتے ہیں کہ؎

پی لوگے تو اے شیخ ذرا گرم رہوگے / ٹھنڈا ہی نہ کردیں کہیں جنّت کی ہوائیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوش صاحب کسی خانقاہ کے درویش یا مندر کے مہنت بن کے رہ گئے ہیں۔ اس پریشانیوں اور کوفتوں کی دُنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی وقت "چہ خورد بامداد فرزندم" کے چکر سے فرار اور کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش ہوتی ہے چنانچہ جوش صاحب نے بھی ادبی مصروفیتوں کے علاوہ ایک شغلِ بے شغلی منتخب کر رکھا ہے۔ شطرنج کھیلنے کا شوق خدا جانے انھیں کب اور کن حالات میں ہوا لیکن رفتہ رفتہ فنکارانہ انہماک کی صورت اختیار کر کے علاج کی جگہ خود ایک مرض بن گیا۔ بارہا یہ دیکھا گیا کہ ایک صبح سے دوسری صبح تک کھیلتے رہے اور اُٹھے بھی تو صرف اس مجبوری سے کہ دُنیا اس انہماک کو دیکھ کر کیا کہے گی۔ آپ کا شمار پنجاب کے مشہور و معروف شاطروں میں ہوتا ہے۔ شطرنج کے متعلق ایک بیاض بھی مرتّب کی ہے جس میں بہت سے مشکل مشکل نقشے حل کئے ہیں۔ شاعری پر بھی اس شوق کا اثر ہونا لازم تھا۔ اکثر اشعار میں شطرنج کی اصطلاحیں اور تشبیہات بڑی خوبی سے استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً ؎

سمجھتے خوب تھے ہم شاطرِ دوراں کی چالوں کو ‏ مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

شکستِ انجامِ قیس و کوہ کن ہی کو نہیں دیکھا ‏ بساطِ عشق و اُلفت پر تو ہر شاطر کو ماتیں ہیں

ایک جگہ آنسو کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج ‏ جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادا میں ہوں

شطرنج کا پیادہ آگے ہی بڑھتا ہے۔ اور مہروں کی طرح پیچھے نہیں ہٹتا۔ پہلے مصرع کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جاں باز۔ غربت اور بساطِ شطرنج خود ہی مذاقِ سلیم سے داد و تحسین کا خراج حاصل کرلیں گے۔

عادات و خصائل کے اعتبار سے جوش صاحب قدیم وضع کے دیہاتی بزرگ ہیں۔ مزاج میں تکلف نام کو نہیں

خود بے حد مخلص اور اخلاص نواز ہیں اور ایسے اشخاص سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ ظاہر داری اور ریاکاری کی ضروری اور کار آمد صفات سے قطعاً محروم ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے حد فراخ دل اور مرنجاں مرنج ہونے کے باوجود ان صفات کے لوگوں کو سخت ناپسند فرماتے ہیں۔ اور ان کے متعلق اپنے خیالات وجذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ طبیعت میں بغض وشر کے فقدان کے باعث دوستی کا نباہ تو عمر بھر کر سکتے ہیں لیکن دشمنی کی راہ پر تھوڑی دور بھی نہیں چل سکتے۔ کسی میں کوئی خوبی ہو تو اس کی تعریف دل کھول کر کریں گے مگر فضول خوشامد اور لابہ گری سے سخت نفرت ہے۔ میں نے اصول پرستی اور خودداری کے بڑے بڑے دعویداروں کو ذرا اور اسی بات کے لئے ذلت کی انتہائی گہرائیوں میں گرتے اور اپنی خودداری بلکہ انسانیت کا خون کرتے دیکھا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے زور شور سے اصول پرستی اور آزادیِ ضمیر کے دعوے کئے جاتے ہیں اتنی ہی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ان دکھاوے کے اصولوں کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ مگر پنڈت جی کے متعلق پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے کسی حالت میں بھی یہ ذلت گوارا نہیں کی اس سے بچنے کے لئے اُنھوں نے اپنی ضروریات میں انتہائی تخفیف کر لی اور قناعت کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اسی لئے فرماتے ہیں ؎

وہ گدا ہوں تاجِ شاہی کی ہوس تو درکنار
سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈ ملی ہُما کو دیکھ کر

اور لیجئے ؎

آپ کیا پوچھتے ہیں قیمتِ خودداریِ دل
ساری دنیا کی بھی دولت مجھے منظور نہیں

ان عادات وخصائل اور شاعر کے کوائف زندگی کا عکس آپ کو آئندہ صفحوں میں جا بجا نظر آئے گا۔ اسی لئے میں نے بعض باتوں کا ذکر ضروری سمجھا۔ ذیل میں تین چار شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر ہر سخن فہم بخوبی اندازہ کر سکتا

ہے کہ ان میں سے کوئی شعر محض رسمی تعداد پوری کرنے یا کسی باغی قافئے کی استادانہ جکڑ بندی کی غرض سے نہیں لکھا گیا اور نہ کوئی خاص مضمون ان کا محرک ہوا ہے، ہر شعر صرف اپنی فطرت کے کسی گوشے سے پردہ اُٹھانے کی خواہش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ جو نامعلوم طور پر شاعر کے تحت الشعور میں موج زن تھی ؂

زمانہ سازیوں سے بندہ پرور ہم کو نفرت ہے　　بھری محفل میں منہ پر صاف کہ دینے کی عادت ہے

اپنی ناداری ہی غیرت سے پسند آئی مجھے　　روزیِ انساں کے حصے نابرابر دیکھ کر

دوسری جانب ؂

میں وہ ہوں وار فلک کا کبھی چلنے ہی نہ دوں　　اس کا جھکنا مری گردن کو جھکا دیتا ہے

اس سے بھی آگے ؂

خاکساری نے مجھے پاک بنایا اے جوشؔ　　ایک بھی داغِ رعونت مرے دامن میں نہیں

اور یہ شعر تو گویا جوشؔ نے صرف اپنے لئے کہا ہے ؂

چہرۂ ظاہر پہ مانندِ گہر　　حسنِ باطن آشکارا چاہیئے

شعر گوئی کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ لیکن بچپن ہی میں شعر سے ان کی دلچسپی اور اتنی گہری رغبت کا باعث شاید خود جوشؔ صاحب کو بھی معلوم نہ ہو گا۔ بہر حال ان کا ماحول اور دنیوی حالات تو ہرگز ہرگز اس کے محرک نہیں ہو سکتے۔ پھر کسی اور خارجی تحریک کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ پس یہی کہنا پڑے گا کہ یہ ایک فطری ودیعت تھی جو موقع ملتے ہی عرصۂ وجود میں آ گئی۔ یہ موقع ملنے کی داستان بھی خاصی دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ پنڈت جی اپنی خداداد ذہانت کی بدولت زیادہ محنت نہ کرنے پر بھی اپنی جماعت میں ہمیشہ اول آتے تھے۔ اس صورت

ہیں دوسری جانب رشک و حسد کا طوفان قدرتی امر تھا۔ بعض چالاک ہم جماعتوں نے شعر و نظم سے ان کی دلچسپی کے پیشِ نظر بڑھاوے دے دے کر ان کی ساری توجہ اردو اور پنجابی کی نظمیں یاد کرنے اور دوستوں کی محفلوں میں سنانے کی طرف پھیر دی اس طرح شوق اور رغبت نے "خبط" کی صورت اختیار کرلی۔ اور دوسرے شاعروں کے شعر سناتے سناتے خود کہنے لگے۔ ابتداء آسان بحروں میں چھوٹی چھوٹی نظموں سے ہوئی لیکن ان ہی کو دیکھ کر بعض اہلِ نظر نے آپ کے متعلق مستقبل قریب میں ایک بہت اچھا شاعر بن جانے کی پیش گوئی کردی تھی۔ چنانچہ ہم جماعتوں کی چال کا یہ نتیجہ نکلا کہ اردو زبان کو ایک اعلیٰ پائے کا شاعر۔ ممتاز ادیب و انشا پرداز۔ بلند مرتبہ نقاد اور فہیم و زیرک ادبی رہنما مل گیا۔

پہلے پہل آپ نے قدرتی مناظر اور اخلاقی مضامین پر اشعار لکھے۔ مگر درسی کتابوں میں اساتذہ کے کلام اور غزلیات پر نظر ڈالنے سے دل میں یہ بات جم گئی کہ اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ کچھ بھی نہیں۔ یہ خیال آتے ہی کلام کا تمام پچھلا ذخیرہ چاک کر کے پھینک دیا اور طبیعت غزل گوئی کی جانب مائل ہو گئی۔ فنی کتابوں کے مطالعے اور ذاتی مشق سے بہت جلد فنِ سخن کے رموز و نکات پر عبور حاصل کر لیا۔ اُس وقت دُنیائے شعر و سخن میں نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی کا طوطی بولتا تھا۔ پنڈت جی بھی ۱۹۰۳ء میں جہاں اُستاد سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینے لگے۔ مگر مہینے میں ایک بار یا کبھی کبھی دو مرتبہ غزل بھیجنے اور اصلاح لینے کا اتفاق ہوتا تھا یہ سلسلہ ڈھائی سال کے قریب جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء میں حضرت داغ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ہمیشہ اپنے ہی ذوقِ صحیح کی رہنمائی پر بھروسا کیا۔ البتہ فن اور زبان کے متعلق جو شکوک ہوتے ان کے متعلق داغ کے ایک ممتاز شاگرد نسیم بھرت پوری سے خط و کتابت کر لیا کرتے تھے۔

ممکن نہ تھا کہ ایسے مشّاق اور قادرالکلام شاعر کی تمام تر توجہ کسی ایک صنف یا صرف دو چار اصنافِ سخن پر مرکوز ہو کے رہ جاتی۔ نظم۔ غزل۔ قطعہ۔ رباعی۔ قصیدہ۔ مرثیہ۔ تاریخ۔ خمریات سب کو نوازا۔ ہر قسم کے مضامین کو شعر اور شعریت کا جامہ پہنایا۔ اور حق یہ ہے کہ جس صنف میں اور جس موضوع پر بھی کچھ کہا۔ حق ادا کر دیا۔ آپ کا یہ شعر "سخن گسترانہ بات" نہیں بلکہ حقیقت و صداقت کا اظہار ہے ؎

ہم نے زمینِ شعر کو زر خیز کر دیا　　　جو نخل بو دیا وہی گُل ریز کر دیا

پھر بھی امر واقعہ یہ ہے کہ غزل پر نسبتاً بہت زیادہ توجہ مبذول ہوئی ہے۔ اس کا ایک سبب تو اس زمانے کا رواج ہو سکتا ہے اور کچھ ذمہ داری مشاعروں کے "مطالبات و ضروریات" پر بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ مگر اتنی ہمہ گیر طبیعت کا مالک۔ ایسا قادرالکلام سخن ور۔ اس قدر فہمیدہ فن کار اور ایسا عفت شعار انسان غزل کے ساتھ والہانہ وابستگی اختیار کرے تو اس انتخاب بلکہ حُسنِ انتخاب کی وجہ ان دونوں باتوں سے زیادہ معقول اور وزن دار ہونی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل اپنی صورت و ترکیب اور نفسِ مضمون ہر دو اعتبار سے شاعری کی بنیاد بھی ہے اور معراج بھی۔ حسنِ بیان شاعری کا اہم ترین جزو ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حُسنِ بیان ہی شاعری ہے۔ حسنِ بیان میں صدقِ محاورہ۔ زبان کی صفائی۔ بیان کی صفائی اور تازگی۔ حُسنِ ترکیب۔ خوبیٔ استعارہ۔ لطفِ تشبیہ۔ مضمون کے ساتھ الفاظ کی مطابقت وغیرہ سب کچھ شامل ہے اور ان کے علاوہ اختصار و جامعیّت۔ ظاہر ہے کہ جب تک حُسنِ بیان کے ان تمام اجزائے ترکیبی پر عبور نہ ہو شاعر اور اس کی شاعری دونوں خام رہتے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ جب تک شاعر غزل نہ کہے ان چیزوں پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ اور جب تک ان پر عبور حاصل نہ کر لے اچھی غزل نہیں کہہ سکتا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ غزل کی صورت و ترکیب ایسی ہے کہ بڑے بڑے

مسائل کو دو مصرعوں کے کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے شاعر کو خوب محنت کی ضرورت پیش آتی ہے پھر موضوعِ سخن چوں کہ جذباتِ قلب ایسی لطیف و نفیس چیز ہوتی ہے اس لئے الفاظ کے انتخاب میں بھی لطافت و نفاست اور برجستگی و پاکیزگی کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس مسلسل محنت اور مشق سے رفتہ رفتہ حسنِ کلام کے مختلف لوازم پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی غزل اس سلسلے میں شاعر کی مدد کرتی ہے۔ اور دوسری جانب جب شاعر کو حسنِ کلام کے جملہ لوازم پر عبور اور اس کے مذاق کو مکمل طور پر جلا حاصل ہو جاتی ہے تو وہ غزل گوئی کا حق ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک مضمون کی متانت اور جذبات کی بلندی و پاکیزگی بھی خالی خولی احساس کی حدود سے گزر کر اس کی عادت بن چکی ہوتی ہے۔ اس لئے کلام دونوں پہلوؤں سے شعریت کا حامل اور شعر کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ میرا دعوے ہے کہ غزل گوئی کی کافی مشق کے بغیر کوئی شاعر حسنِ کلام کی ضروری شرائط سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

غزل کی مخالفت میں کچھ مدت سے ایک ہڑبونگ سی مچ رہی ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ اس طوفان میں بعض سنجیدہ و فہمیدہ اشخاص کے بھی پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس مخالفت میں جو لوگ سب سے پیش پیش ہیں اُنھیں چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو اپنے عجزِ طبیعت کے باعث غزل گوئی کی پابندیوں اور جکڑبندیوں کے اندر رہ کر شعر نہیں کہہ سکتے اور مخالفت کا شور بلند کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں معقولیت اور نظام قائم رکھنے کے لئے کچھ اصول اور پابندیاں کارآمد بلکہ لازمی ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ حضرات جن کی فطرت میں لطافت و نفاست

اور خلوص ورقت کی کمی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ جذباتِ قلب" کی قدر و اہمیت کو سمجھنے سے عاری ہوتے ہیں اور شاید نیک نیتی سے اسارا زور اور توجہ "افکارِ دماغ" پر صرف کر دیتے ہیں۔ تیسرے وہ ناصحانِ مشفق جن کی نااہلیت اور جہالت غزل کو محض سفلی جذبات کی شاعری سمجھتی ہے اخلاق و پاکیزگی کے یہ خود رو اجارہ دار سب سے زیادہ شور مچاتے ہیں "تاکہ خلوتوں کے کارِ دیگر پر پردہ پڑا رہے۔ چوتھا گروہ افادیت اور قومیت کے ڈھنڈورچیوں کا ہے۔ جن کے نزدیک شاعری کا مقصد و منشا صرف یہ ہے کہ ہر غزل اور نظم سے یا تو من ڈیڑھ من گندم پیدا ہو یا کسی کارخانے میں ہڑتال اور شہر میں فساد ہو جائے۔

خیر یہاں اس بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ جوش صاحب نے غزل پر زیادہ توجہ اس لئے فرمائی کہ وہ اس کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ ہیں اور کلام کی پاکیزگی اور بلندی کے لئے اُن پابندیوں کو مفید سمجھتے ہیں جو غزل گو شاعروں کو اپنے اوپر عائد کرنی پڑتی ہیں۔ اسی حُسنِ انتخاب کا نتیجہ ہے کہ غزلوں کے علاوہ جوش صاحب کا اور کلام بھی اس لطافت و نفاست اور بلندی و پاکیزگی کا حامل ہے جو محض افکارِ دماغ کی فلسفیانہ یا احمقانہ غلامی سے نہیں بلکہ جذباتِ قلب اور افکارِ دماغ کے مناسب امتزاج ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

کلام میں یہ محاسن پیدا کرنے کے لئے جوش صاحب کو اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کرنی پڑیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ طبیعت کی نفاست پسندی اور حُسنِ مذاق نے ان پر بہت

سی پابندیاں عائد کردیں۔ کیا مضمون و موضوعِ سخن اور کیا زبان و بیان ہر معاملے میں آپ کو انتخاب حسنِ انتخاب اور انتخاب در انتخاب کا ایک قابلِ تعریف چکر نظر آئے گا جو اپنی محنت طلبی کی بنا پر بڑے بڑے قادر الکلام اُستادوں کے لئے روح فرسا ثابت ہو مگر نتائج کے اعتبار سے یقیناً لائقِ تحسین اور قابلِ تقلید ہے۔ جوش صاحب نہ صرف عام متروکات کے نہایت سختی سے پابند بلکہ زبان اور مضمون دونوں میں انھوں نے اپنے لئے کچھ مزید پابندیاں بھی وضع کرلی ہیں۔ جن کا ذکر خود ہی کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام فصاحت اور حسنِ بیان کا قابلِ ستائش نمونہ بن گیا ہے۔ لیکن حسنِ بیان کا یہ مطلب نہیں کہ آپ صرف زبان کے چٹخارے پر جان دیتے ہیں یا کرتب دکھانے کو شاعری کی معراج سمجھتے ہیں۔ درحقیقت آپ ان دونوں چیزوں سے نفور ہیں۔ ایسے کلام کو پسند نہیں کرتے جس میں زبان کے چٹخارے اور الفاظ کے ہیر پھیر کے سوا کچھ نہ ہو۔ اُن کے کسی شعر سے بھی آپ کو یہ احساس نہ ہوگا کہ یہ صرف کسی محاورے یا کہاوت کو نظم کرنے یا ایسا ہی کوئی اور کرتب دکھانے کے لئے کہا گیا ہے۔ جہاں کہیں آپ نے کوئی محاورہ نظم کیا ہے یا الفاظ کے ہیر پھیر سے کلام میں لطافت پیدا کی ہے کسی کو شبہ تک نہیں ہوسکتا کہ یہ شعر صرف اسی مقصد کے پیشِ نظر کہا گیا۔ بلکہ یوں معلوم ہوگا کہ شاعر اپنی دھن میں اظہارِ خیال کر رہا تھا اور یہ محاورہ خود بخود زبان پر آگیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دورِ خزاں سے سوکھ کے کانٹا ہوئے ہیں پھول — اک خارزار صحنِ گلستاں ہے آج کل

انجامِ بقا تو ظاہر ہے انجامِ بقا پر بحث نہ کر — ہر سانس خبر دیتی ہے تجھے ہستی کے ہوا ہو جانے کی

شوقِ کمال اے دلِ ناکام کیا کرے
تو نے کمالِ شوق دکھایا نہیں ہنوز

جل بجھا وہ شمع پر میں مر مٹا اس رشک میں
موت پروانے کی تھی یا موت کا پروانہ تھا

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جائے گی

اُمید پہ موقوف ہے جاں بازیٔ اُلفت
دل بیٹھ گیا ہو تو ستم اُٹھ نہیں سکتا

اس قسم کے بہت سے اشعار موجود ہیں جن سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جب تک کچھ کہنے کے لئے نہ ہو جوشؔ صاحب محض کسی محاورے کو نظم کر دینے کے لئے شعر نہیں کہتے۔ اس کے علاوہ ایک بہت ہی بڑی خوبی آپ کے کلام میں یہ ہے کہ مضمون اور بیان دونوں کی پیچیدگی سے بڑی سختی کے ساتھ احتراز کیا گیا ہے۔ دقت پسندی اور فارسیت کی فضول بھرمار آپ کے نزدیک علمیت کا "نشان" نہیں بلکہ ایک قابلِ ترک لغویت ہے۔ کیوں کہ اس سے قادر الکلامی کی جگہ عجزِ طبع کا اظہار ہوتا ہے۔ اور شاعر فصاحت کے خونِ ناحق کا مجرم بن جاتا ہے۔ ان کے کلام میں مضمون کی بلندی اور تخیّل کی فلک پیمائی کے بے شمار نمونے نظر آئیں گے لیکن انھیں ایسی صفائی اور اس قدر سادگی کے ساتھ روزمرّہ کی ٹکسالی زبان میں پیش کیا گیا ہے کہ ہر شعر کو سہلِ ممتنع کی تفسیر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ذرا سنئے جبر و اختیار کے مسئلے پر مجاز کی زبان میں کیوں کر اظہارِ خیال ہوتا ہے ؎

محبّت کہاں یہ تو بے چارگی ہے۔ ستم بھی سہیں پھر کرم اس کو سمجھیں

یہ جبر اس لئے کر لیا ہے گوارا کہ اس کے سوا کوئی چارا نہ دیکھا

دوسرے رنگ میں ؎

اعمال کی پرسش نہ کر اے داورِ محشر　　مجبور تو مختار کبھی ہو نہیں سکتا

وحدت و کثرت ؎

ایک سے ایک جُدا شکل و طبیعت دیکھی　　میری آنکھوں نے ہر اک چیز میں وحدت دیکھی

طلبِ صادق کا ورس اور وہ راہیں جن کے بغیر راہ رو کا منزلِ مقصود پر پہنچنا ناممکن ہے ؎

وسوسہ کوئی نہ رہ جائے دلِ پُرشوق میں　　شورشِ دریا بھی ہو خاموشیٔ صحرا بھی ہو

دلِ پُرشوق کو شورشِ دریا اور تمام وسوسوں کے مٹ جانے کو خاموشیٔ صحرا کہہ کر کتنا وسیع مضمون کس قدر اختصار اور صفائی سے ادا کر دیا ہے۔

کفر و ایمان کا جھگڑا ؎

کچھ جذبۂ صادق ہو کچھ اخلاص و ارادت　　اس سے ہمیں کیا بحث وہ بت ہے کہ خدا ہے

اور پھر دریا بہ حباب اندر کی نہایت ہی پسندیدہ مثال ؎

اک جہاں ہو جس کا مشتاقِ جمال　　سخت حیرت ہے وہ کیوں رُوپوش ہے

زبان و بیان کے معاملے میں جوش صاحب کے کلام کی چند خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں زبان کی صفائی اور بیان کی سادگی ہے۔ محاورے کے صدق و صحت کو آپ کی نظر میں مذہبی عقیدہ کے برابر اہمیت حاصل ہے۔ حُسنِ ترکیب۔ لطفِ تشبیہ و خوبیٔ استعارہ۔ کلام و بیان

کی تازگی اور شوخی جوش صاحب کے نزدیک بہت ضروری چیزیں ہیں اور ان کے نہایت ہی پسندیدہ نمونے آپ کو ان کے کلام میں جابجا نظر آئیں گے۔ لیکن وہ ان چیزوں پر زبان کی صفائی اور بیان کی سادگی کو کبھی قربان نہیں کرتے۔ ترکیب۔ تشبیہ استعارہ۔ کنایہ وغیرہ کو وہ بھی عروسِ سخن کا زیور سمجھتے ہیں لیکن زیور کو زیور کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ ایک تو زیور کے انتخاب میں بے حد دقتِ نظر اور حسنِ مذاق کا ثبوت دیتے ہیں۔ دوسرے زیور گہنے کا اتنا ڈھیر نہیں لگا دیتے کہ عروس بے چاری گہنا کے رہ جائے یا اپنی ہستی ہی کھو بیٹھے۔ سادگی۔ صفائی اور سلاست کا یہ معیار بڑے بڑے کہنہ مشق شاعروں کے لئے بھی بہت بھاری پتھر ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایک طرف تو بلند اور دقیق مضامین کو دوسرے کی سادہ اور بامحاورہ زبان میں پوری صفائی اور وضاحت سے پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ دوسرے یہ احتیاط اشد ضروری ہے کہ محاورۂ عام اور محاورۂ عوام میں جو نازک اور مبہم سی حدِ فاصل ہے وہ کسی وقت نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور سلاست و سادگی کا ناقص مفہوم شعر کو بازاری ٹھٹھول نہ بنا ڈالے۔ داغ کا تتبّع کرنے والے اکثر و بیشتر اس احتیاط سے کام نہ لینے کے باعث بہک گئے۔ جوش صاحب داغ کے شاگرد ہیں اس لئے وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ صدقِ محاورہ۔ صفائیٔ زبان۔ سادگیٔ بیان اور شوخیٔ کلام میں اُستاد کی مکمل پیروی کرتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے کلام کو داغ دار نہیں ہونے دیا۔ اور داغ کے تتبّع کا دعویٰ کرنے والے بہت سے خوش فہم خام کاروں کی طرح اُستاد کی طرزِ سخن کو بدنام نہیں کیا۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ اُن سے میرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

اے شیخ اگر خُلد کی تعریف یہی ہے　　　　بیں اس کا طلب گار کبھی ہو نہیں سکتا

مصرعِ اولیٰ میں ایک لفظ "یہی" کس قدر پُر معنی ہے۔ اس کا مفہوم پانچ دس جملوں میں بھی اس خوبی سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ کی کفایت کے ساتھ ہی جامعیت اور تازگیِ بیان کی تمام شرائط کی بھی تکمیل ہو گئی۔

جہاں بھی حُسنِ دل آرا دکھا گیا کوئی　　　　وہیں فریبِ تمنّا میں آ گیا کوئی

دونوں مصرعوں میں "کوئی" کا لفظ دو مختلف اشخاص کے لئے استعمال ہوا ہے۔ بس اسی سے شعر میں نہ صرف جان پڑ گئی بلکہ ایک تیکھا پن اور تازگی بھی آ گئی۔

یہ تو اے شرطِ محبّت کوئی انصاف نہیں　　　　ہم تمنّا تو کریں عرضِ تمنّا نہ کریں

دوسرا مصرع ایک عام اور پیش پا افتادہ مضمون کا حامل ہے لیکن پہلے مصرع میں محبّت کی شرط عائد کرنے والوں کی جگہ خود شرطِ محبّت کو مخاطب کیا گیا۔ اس دل آویز ترکیب سے الفاظ کی کفایت کے ساتھ ہی اندازِ بیان میں ندرت اور شوخی آ گئی۔

لفظوں کے انتخاب اور الٹ پھیر کو دیکھیئے ؎

مجھ سے کس بات پہ اُلجھیں گے حریفانِ سخن　　　　میں نے اُلجھا ہوا مضموں کبھی باندھا ہی نہیں

ہم اور دردِ دل کے لئے چارہ سازیاں　　　　یہ روگ اپنے جی کو لگایا نہیں ہنوز

"روگ" اور "جی"۔ "دردِ دل" ہی تو ہے لیکن دو ٹکڑے ہو کر اور بھی مزہ دے گیا ؎

جز اشک و آہ تجھ میں ہے کیا اے دیارِ عشق　　　　بے زار ہو گئے تری آب و ہوا سے ہم

جہاں اشک آب اور آہ ہوا ہو وہاں کی آب وہوا سے بیزار کیوں نہ ہوتے؟ پھر ؎

اشارہ تک نہ لکھا اُس نے کوئی ربطِ باہم کا — بہت بے ربط ہے خط کا جواب اوّل سے آخر تک

بسترِ خاک ہونا زندگی میں لطفِ تنہائی — رہے دو دو فرشتے ہم رکاب اوّل سے آخر تک

چند آنسو تھے جو رُخ پر آب بن کر رہ گئے — آئینہ رو یا تھا انجامِ سکندر دیکھ کر

زبان وبیان کے محاسن کی مزید مثالیں پیش کر کے میں طولِ کلام کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ درحقیقت اس کی ضرورت بھی نہیں۔ مجموعۂ کلام آپ کے سامنے ہے۔ پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ آپ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ داغ کا یہ مقطع اُن کے شاگرد کے کلام پر بھی ہر اعتبار سے صادق آتا ہے ؎

جنابِ داغ کے اشعار دیکھتے جاؤ — کوئی نہ کوئی ہر اک شعر میں ہے بات ضرور

اسی طرح مضمون کے معاملے میں بھی جوش صاحب کی نفاست پسند طبیعت نے وہی انتخاب در انتخاب کا چکر چلایا۔ تمام لغویات کو ترک کرنا ہی تھا لیکن بعض ایسے مضامین کو بھی رکیک پست یا مکروہ سمجھ کر اپنے لئے متروک قرار دے دیا جو بعض شعرا کا سرمایۂ شاعری ہیں۔ وہ صرف مضمون کی ندرت ہی کے شیدائی نہیں بلکہ اس کی متانت اور پاکیزگی کو بھی اشد ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جذبات کی بلندی اور طہارت بھی کسی موقع پر اور کسی صورت سے نظر انداز نہیں ہوتی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاعری میں آپ کا دل پسند میدان "تنگنائے غزل" ہے۔ اور اردو شاعری کی یہی صنف ہے جس کے نفسِ مضمون اور موضوعِ سخن پر سب سے زیادہ اعتراضات ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراض بالکل معقول اور قابلِ قبول تھے اور اگر بعض لوگوں نے انہیں قبول نہیں کیا تو یہ اُن کی ہٹ دھرمی تھی

یا بے بضاعتی یعنی وہ بے چارے اپنے مخصوص دائرے سے باہر قدم ہی نہ رکھ سکتے تھے اور "چہ کند بے نوا ہمیں وارد" کی مجبوری کے زیر اثر کولھو کے بیل بنے رہے۔ غزل کے مضامین میں جوشِ جذبات، جوشِ تمنا، ہجر کا رونا، وصل کی آرزو، رشک و رقابت، سوز و گداز، نالہ و فریاد، شکوہ و شکایت، تاک جھانک، نامہ و پیام، رندی و مستی سب کچھ ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ سوز و رقت کے بغیر غزل لطیف ترین صنفِ شعر کی جگہ سیاست داں کی ڈائری یا پنساری کا بیجک بن کے رہ جائے۔ لیکن دوسری جانب وہ شاعر بھی قابلِ معافی نہیں جو غزل کو مرثیہ بنا ڈالتے ہیں اور اپنی قافیہ پیمائی کو ایسی رکیک اور مکروہ بوالہوسی سے آلودہ کرتے رہتے ہیں جس پر غنڈے، شہدے اور زنانِ بازاری بھی شرمسار ہوں۔

جوش صاحب کے ہاں آپ کو غزل کے تمام لوازم نہایت پسندیدہ اور پاکیزہ صورت میں نظر آئیں گے اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوگی کہ انھوں نے اپنی غزلوں کے دامن کو ہر قسم کی لغویات و مکروہات سے پاک رکھا ہے۔ انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ غزل قلبِ انسانی کے بلند ترین جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے اور یہ صنفِ شاعری فطرتِ انسانی کے لطیف ترین پہلو کی آئینہ دار ہوتی ہے اس لئے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ نفسِ مضمون اور اندازِ بیان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ شاعری میں غزل کا حقیقی مقام کیا ہے ؎

اب دعا سے بھی حذر ہے مجھ کو   کیا سمجھ لیں وہ اسے کیا جانے

مجبورِ احتیاط کی بے بسی کا کتنا درست اور کس قدر لطیف نقشہ ہے! اب ندرتِ مضمون اور سادگیِ بیان کے ساتھ حسنِ تعلیل کی ایک بہت ہی پیاری مثال ملاحظہ ہو ؎

نہیں ہے تاب عالم کو بیانِ سوزِ نہاں کی　　ہمارے عشق کا دُنیا میں چرچا ہو نہیں سکتا

تغزّل کی پاکیزگی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی؟ فرماتے ہیں ؎

بار ہے دل پہ ندامت اُن کی　　جیت بھی ہار ہوئی جاتی ہے

پُرسشِ حال پہ حال اپنا سنانا ہی پڑا　　ایک ہنستی ہوئی صورت کو رُلانا ہی پڑا

اپنی وارفتگیِ غم کو چھُپانا ہی پڑا　　آ گئے وہ تو مجھے آپ میں آنا ہی پڑا

ایک اور رنگ ؎

بہت سیر کی باغِ جنّت کی ہم نے مگر کچھ مزہ زندگی کا نہ دیکھا

کسی دل میں دردِ محبت نہ پایا کسی دل میں داغِ تمنّا نہ دیکھا

جنونِ محبت میں دیوانگی ہیں۔ تری بے رُخی کا بھی ہیں قدر داں ہوں

بڑا تو نے احسان مجھ پر کیا یہ۔ تماشا بنا کر تماشا نہ دیکھا

کرم اے سوزِ پنہانی کہ یہ الزام بھی آیا　　تمھاری بے زبانی اب زباں معلوم ہوتی ہے

مجھ سے میرے شوقِ اُلفت کا گلہ ہونے لگا　　آج کیا کرنے لگے تم۔ آج کیا ہونے لگا

کیوں کر کہوں کہ بانیِ بیداد کون ہے　　تقدیر ہی کا نام لئے جا رہا ہوں میں

غزل کے مضمون پر اعتراض کرنے والوں کی توجہ تغزّل کے بعد زیادہ تر رندی و شوخی۔ بیزاری اور طنز کے مضامین پر مبذول ہوتی ہے۔ اس لئے میں ان ہی کی ایک ایک دو دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ مضمون کی نُدرت۔ متانت اور بلندی کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان بھی ملحوظِ خاطر رہے ؎

بیچنے کے لئے ہوتی ہے اگر طاعتِ حق　　　شیخ صاحب یہ تجارت مجھے منظور نہیں

مذہب کے علم بردار لوگوں کو جنت اور حوروں کا لالچ دے کر طاعتِ حق کی رغبت دلایا کرتے ہیں۔ اُن کی مذمت میں طاعتِ حق کے متعلق اختلافِ رائے کا اظہار کس لطیف مگر مدلل و محکم پیرائے میں کیا ہے اب اللہ میاں سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں ؎

مجھ پہ دنیا میں قیامت رہی برپا ہر روز　　　اور اے داورِ محشر یہ قیامت کیسی

بظاہر سیدھا سادہ شعر ہے۔ لیکن دُنیا کے کم از کم نوّے فی صدی انسان اسے سو فی صدی اپنے خیالات کی ترجمانی سمجھیں گے۔

مضمون اور کلام کی شوخی کے نمونے ؎

شکرِ نعمت کے لئے خلد میں آنا ہی پڑا　　　ورنہ اس گلشنِ بے کیف میں رکھا کیا ہے

کچھ اور فائدہ نہ سہی دل لگی تو ہے　　　بے کیفیوں میں صحبتِ واعظ بُری نہیں

کہوں شرحِ جنوں کیوں کر خردمندوں کی محفل میں　　　یہ وہ نکتے ہیں جن کو اہلِ دانش کم سمجھتے ہیں

تصوّف اور رندی کے مضامین پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شاعر معقولیت کی حدود سے تجاوز کر کے ایسی گستاخیاں کر جاتے ہیں جو شیخ و واعظ کے مذہبی احساسات کے علاوہ عام لوگوں کے مذاقِ سلیم پر بھی گراں گزرتی ہیں۔ جوشؔ صاحب کے کلام میں آپ کو تصوف اور رندی کے سیکڑوں اشعار ملیں گے لیکن ان میں معقولیت کی حدود سے تجاوز تو کجا اُلٹا اس بات کا ثبوت ملے گا کہ قادر الکلام اور حُسنِ مذاق رکھنے والا شاعر ان حدود کے اندر رہ کر بھی ایسے نفیس اور پسندیدہ اشعار کہہ سکتا ہے جن سے رندانہ الحاد کی تمام شرائط کی تکمیل ہو جائے اور پیرِ مغاں سے وفاداری کا دعویٰ مشکوک نہ ہونے پائے۔ ملاحظہ ہو ؎

دعا سے ہاتھ اُٹھانے کے سوا ہیں اور کیا کرتا
درِ ایجاب نے تو ایک بھی مشکل نہ آساں کی

امانت کا بھرم بھی کھو دیا بارِ امانت نے
الٰہی یہ شرف بخشا کہ شامت آئی انساں کی

حرم سے کچھ آگے بڑھے ہم تو دیکھا
جبیں کے لئے آستاں اور بھی ہیں

ہُو کا عالم حرم میں ہے اے شیخ
ہم تو دو دن یہاں بسر نہ کریں

یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی
اُسے شوق دید عطا کیا جو نگہ کی تاب نہ لا سکے

اعمال کی پرسش نہ کرا ے داورِ محشر
مجبور تو مختار کبھی ہو نہیں سکتا

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی سہو ہوا ہو
میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

تُو ہی اپنا مقام جانتا ہے
اک ظلوم و جہول کیا جانے

داد کے قابل ہیں اس کی مصلحت اندیشیاں
جس نے توبہ توڑ ڈالی ہو گھٹا کو دیکھ کر

پی لو گے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے
ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنت کی ہوائیں

دراصل جوش صاحب کے اشعار میں انتخاب کا مسئلہ بہت مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے یونہی جستہ جستہ اشعار پیش کر دیئے ہیں بطور مشتے نمونہ از خروارے۔ یقیناً آئندہ صفحوں میں آپ کو انہی مضامین کے ان سے بہتر اشعار نظر آئیں گے۔ بہر حال میں دو چار طنزیہ اشعار پیش کر کے یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں ؎

خلوصِ الفت کی جوش قیمت تمھیں جو اس وقت مل رہی ہے
کہیں بھی پوچھو یہی کہیں گے کہیں بھی جاؤ یہی ملے گی

بد ذوقیِ جہاں سے خاموش ہو گئے سب
ہر طائرِ خوش الحاں منقار زیرِ پر ہے

قائل خدا کا یوں تو ہے سارا زمانہ جوش
کتنا ہے احترامِ خدا - کچھ نہ پوچھئے

آدمی ہیں شمار سے باہر قحط ہے پھر بھی آدمیّت کا

ہر نااہل کے قدموں پر ہم جھک کر سجدہ کرتے ہیں اک کم بخت ہوس کی خاطر جو نہ کیا تھا کرتے ہیں

آج کل ہر ادیب کو ترقی پسند یا رجعت پسند قرار دینا بھی فیشن میں داخل ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں وہ بھی ترقی پسند اور رجعت پسند کی کوئی واضح اور جامع تعریف اور ان دونوں گروہوں میں تمیز کے لئے کوئی کسوٹی پیش نہیں کر سکے۔ ترقی پسند کہلانے والوں میں سے معدودے چند سلجھے ہوئے افراد کو چھوڑ کر باقی حضرات نے ترقی پسندی کو ایک ہڑبونگ بنا ڈالا ہے اُن کے نزدیک ترقی پسندی کی اولین شرط یہ ہے کہ ادب کے تمام اصولوں اور معیاری قوانین سے رشتہ توڑ کر بے یقینی اور آوارہ خیالی کے لق و دق صحرا میں اندھا دھند ادھر اُدھر دوڑتے پھریں۔ ادبی روایات ان کے خیال میں "صحت مند" ادب کے لئے ہیضہ، نمونیا اور تپ دق کا اثر رکھتی ہیں۔ اگر کسی شاعر کی کائنات "شعر و افکار و ماغ" تک محدود نہیں بلکہ جذبات قلب کو بھی اس میں دخل حاصل ہے تو اس کے رجعت پسند ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر وہ خیالات اور مضامین کی پاکیزگی اور زبان و بیان کی عمدگی کا قائل ہو۔ صحتِ زبان۔ بحور و اوزان۔ قافیہ و ردیف نیز شعر و سخن کے دوسرے محاسن و معائب کا خیال بھی رکھتا ہو تو آنکھیں بند کر کے اس کی سات پشتوں کو رجعت پسند قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس معیار کے مطابق جوش صاحب پکّے رجعت پسند ہیں۔ زبان و بیان نیز مضمون کی پاکیزگی اور تخیل کی سلامت روی کے بارے میں ان کے خیالات و معتقدات کا اندازہ اُن کے کلام ہی سے ہو سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک ادب کو ماضی سے سراسر بے تعلق اور آزاد کر لینے کی کوششیں کم فہمی اور خام کاری کی دلیل ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی ادیب اور کسی زمانے کا ادب اپنے ماحول سے بے نیاز اور غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ سمجھ لینا حماقت ہے کہ جس چیز کو نام نہاد ترقی پسند ادیب "حال" کہتے ہیں اس کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں اور وہ یوں ہی خلا میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تغیر پذیر دُنیا میں کوئی فن کار بدلتے ہوئے حالات کے اثرات اور تقاضوں سے بے نیاز

نہیں رہ سکتا لیکن دنیا کی یہی تغیر پذیری "حال" کو دنیا کی سب سے غیر مستقل اور ناپائیدار چیز بھی تو بنا دیتی ہے۔ "حال" کیا ہے؟ ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک مبہم سی حدِ فاصل۔ ہر لمحہ اگر اپنے سے پہلے لمحے کے مقابلے میں "حال" ہوتا ہے تو عین اگلے لمحے کے مقابلے میں "ماضی" بن جاتا ہے۔ پس ماضی اور حال کی بحث کو اگر منطقی حد تک لے جائیں تو "حال" کی حیثیت محض ایک "لمحہ" کی رہ جاتی ہے اور ہر ایک لمحے کے لئے اپنے سے پہلے لمحہ کے تمام واقعات، اصول، عقائد اور تقاضے "روایات" بن جاتے ہیں پھر روایات سے مفر کا امکان کہاں رہ گیا؟ پس یہی وجہ ہے کہ دیگر معقولیت پسند ادیبوں کی طرح جوش صاحب بھی روایات کی اہمیت کو کسی موقع پر نظر انداز نہیں کرتے وہ موجودہ فضا میں سانس لیتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ روایات سے استفادہ کرنے اور کورانہ تقلید میں کوئی فرق نہیں۔ ان کے نزدیک ادب میں تغیرات صرف اسی صورت میں قابلِ تحسین ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اصول و قواعد کے ماتحت ایک فطری تسلسل کی صورت میں جلوہ گر ہوں۔ اس صورت میں تغیر کے فن کو حسن اور شادابی حاصل ہوتی ہے لیکن اگر یہ تغیر ارتقا کا ثمرہ نہ ہو تو جدت کی بجائے ایک مکروہ بدعت بن کے رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ جوش صاحب ترقی پسند ہیں یا رجعت پسند۔

جب یہ چند سطور لکھنے کا ارادہ کیا تو ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ معاملہ اس قدر طول پکڑ جائے گا۔ ع۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ لیکن اب اتنا کچھ لکھنے پر بھی یہ احساس باقی ہے کہ حق ادا نہیں ہو سکا۔ پس اپنی خامی کا اعتراف کر کے اس امید کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ مجھ سے بہتر لکھنے والے جوش صاحب کے کلام پر اظہارِ رائے کرتے وقت اس کی تلافی کر دیں گے۔

مَترُوکات

۱۔ رنگ قدیم کے تمام عُریاں مضامین اور اُن کے تمام مُتعلّقات مثلاً زلف و کمر، خال و خط مانگ۔ اورو۔ چاہ زنخداں۔ دوپٹّہ۔ انگیا۔ جوبن وغیرہ۔

۲۔ یاں۔ داں۔ پہ بہ معنی لیکن) اگر بہ معنی شاید۔ پر بہ معنی مگر۔ وے بہ معنی لیکن۔ ولیکن تلک۔ مت۔ حرفِ نفی۔ گر حرف شرط۔ تب حرف جزا۔ گرچہ بجائے اگرچہ۔ وگرنہ بجائے ورنہ۔

۳۔ آوے ہے۔ جاوے ہے۔ آوے۔ جاوے (خلافِ روزمرّہ)

۴۔ بتلا۔ سِکھلا۔ بٹھلا۔ دکھلا (لام زائد)

۵۔ فارسی اور عربی الفاظ میں تخفیفِ حرفِ علّت۔ صرف وہ تخفیف روا سمجھی گئی ہے جس کے بعد الف وصل آتا ہو۔

۶۔ فارسیت۔ توالیِ عطف ۔ توالیٔ اضافت۔ پس مردن۔ پس از مردن۔ بعد از مرگ بعد از فنا۔ پس از فنا۔ تابِ شنیدن۔ تاب گفتن۔ بس کہ۔ اے کہ۔ کاش کے۔ تا بہ معنی جب تک۔ نے بہ معنی نہیں۔

۷ - لیجو - کیجو - دیجو - لیجے - کیجے - دیجے -

۸ - رکھا - چکھا (بے تشدید)

۹ - اسم کے آخر میں الفِ ندا ، مثلاً سعدیا - حافظا - واعظا وغیرہ - اس پابندی میں دو لفظ مستثنےٰ سمجھے گئے ہیں - خدایا اور ساقیا - وجہ یہ ہے کہ بعض محل ایسے بھی ہیں کہ وہاں یہی صورت زیب دیتی ہے - مثلاً

۱ - نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

۲ - ساقیا مژدہ کہ گھن گھور گھٹائیں آئیں

۱۰ - فعل کے الفاظ کی تقدیم و تاخیر اور اُن میں فاصلہ مثلاً آتا ہے کی جگہ ہے آتا ؏

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ

دیکھ لیا کی جگہ لیا دیکھ اور چھوڑ گئے کی جگہ گئے چھوڑ بھی اسی قبیل سے ہیں - ؏

گئے چھوڑ اچھی وفا تم نے کی

۱۱ - چاہت - چاہ ہندی الاصل ہے - اس کے ساتھ تے مصدری معیوب ہے

۱۲ - پاؤں - گاؤں - چھاؤں فعْلُن کے وزن پر - مثلاً - ؏

بلائیں آ کے لیں اُن کی بلائیں سر سے پاؤں تک

یہ ترک بہ وجہِ ثقالت اختیار کیا گیا - اور انھیں فاع کے وزن پر فصیح سمجھا گیا ہے

۱۳ - دیواں . عرفاں وغیرہ قافیہ ہو . تو مطلع میں ساماں . ارماں کا قافیہ . یا کفن . دہن وغیرہ قافیہ ہو . تو مطلع میں چمن . سمن . انجمن . کا قافیہ . وجہِ ترک یہ ہے کہ ان قوافی میں حرف روی کے حروف ماقبل مختلف نہیں ہیں ۔

۱۴ - مصرع کے شروع میں ضمیر واحد متکلم یعنی میں کی تخفیف ۔ مثلاً ۔ ؎

میں کہتا رہ گیا ظالم مرا دل ہے مرا دل ہے

لیکن اس تخفیف کے بعد الفِ وصل آتا ہو . تو تخفیف کو روا سمجھا گیا ہے . مثلاً ؎

میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

۱۵ - کافِ علت . میرے خیال میں یہ بھی فارسیت ہے . اردو کی بول چال میں مستعمل نہیں نہیں ہوتا . کافِ بیانیہ . کافِ مفاجات اور کافِ صلہ ہی مستعمل ہوتے ہیں . مثلاً میں آج وہاں نہیں جاؤں گا . کہ پاؤں پر چوٹ آئی ہے . یہ جملہ بول چال کے خلاف ہے . اسی طرح ؎

۱ . اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
۲ . بہے بحرِ فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی — کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیرِ قاتل کی
۳ . ہزار شکر نہ ضائع ہوئی مری کھیتی — کہ برق و سیل میں تقسیم دانہ دانہ ہوا
۴ کہے ایک جب سُن لے انسان دو — کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

درحقیقت یہ کافِ علت اساتذۂ فارسی کی تقلید میں مستعمل ہوتا رہا ہے۔ مثلاً سعدی ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت ۔۔۔ کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

۱۶۔ ترکیبی صورت میں ہائے مختفی کو قافیہ میں الف بنا دینا۔ مثلاً ؎

شمع تیرا آب گریہ پھر یہ کس کام آئے گا ۔۔۔ جب پڑی بے غسل یوں ہی لاشِ پروانا ہے

ترکیبی صورت میں ہائے مختفی آئے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جزوِ اوّل کے ساتھ ہو۔ مثلاً شعلہ رُو۔ جلوہ گر وغیرہ۔ دوسری صورت یہ کہ وہ جزوِ دوم کے ساتھ ہو مثلاً دیرمے خانہ۔ دمِ نظّارہ وغیرہ۔ پہلی صورت میں الف کا استعمال مثلاً خستا جگر۔ جلوا فگن خندا جبیں تو ہر جگہ قابلِ ترک سمجھا گیا ہے۔ دوسری صورت یعنی جزو دوم کی ہائے مختفی کو الف بنانا صرف قافیہ میں قابلِ ترک قرار دیا ہے۔ اور جگہ نہیں۔ قافیہ میں یہ الف اس بنا پر کہ لفظ کی ترکیب فارسی لفظ کے ساتھ حسنِ قافیہ کو مٹاتی ہے۔ قابلِ ترک خیال کیا ہے۔ اور جگہ ایسی ترکیب ضرورت شعری کی بنأ پر ناقابلِ ترک ہے۔ اور ویسے بھی یہ کثیر الاستعمال ہے مثلاً ؎

ضبطِ گریہ میں نہیں کرتا کہ رہتا ہے خیال ۔۔۔ سوکھ کر کانٹا نہالِ آرزو ہو جائے گا

۱۷۔ ترکیبی صورت میں آخری نون کا اعلان۔ مثلاً ؎

جھوٹ ہی جانو کلام اُس رہ زنِ ایمان کا

وجۂ ترک یہ ہے کہ فارسی ترکیب میں اہلِ فارس ہی کا دستور ماننا پڑے گا۔

۱۸۔ جو الفاظ اُردو میں نون کے اعلان سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً خون۔ جان وغیرہ۔ انفرادی صورت میں اُن کے نون کا اعلان نہ کرنا۔ مثلاً

۱۔ اب جاں بھی نہیں ہے میرے تن میں

۲۔ مری امید بھی خوں رو رہی ہے

مری جاں بہ اخفائے نون بھی اسی قبیل سے ہے۔

۱۹۔ بسمل۔ دمِ بسمل بہ معنی وقتِ ذبح۔ وجہِ ترک یہ ہے کہ بسمل بمعنی ذبح درست نہیں

۲۰۔ سدا بہ معنی ہمیشہ

۲۱۔ بھانا (پسند آنا) اور اس کے تمام افعال مثلاً بھائی ہے (پسند آئی ہے)

۲۲۔ کرانا۔ دھروانا کے مصادر اور اُن کے افعال (موجبِ ذم ہیں)

۲۳۔ یار بنگار بہ معنی محبوب بغیر ترکیبِ فارسی۔ مثلاً ؎

۱۔ مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو کے خونِ جگر

۲۔ یار کی بے وفائیاں توبہ

۲۴۔ کیوں کر کا ایسا استعمال کہ اس کی جگہ کیوں استعمال کیا جاسکے۔ مثلاً ۔ ۶

کیوں کر نہ حالِ غیب ہو مستوں پہ آئینہ

۲۵۔ گھائل بہ کسرِ ثالث یعنی اس کا قافیہ بسمل بمنزل کے ساتھ

۲۶۔ میت بہ فتحِ ثانی یعنی اس کا قافیہ دولت وغیرہ کے ساتھ

۲۷۔ داماں بغیر ترکیبِ فارسی۔ مثلاً۔ ؎

گرد اُڑ کر نہیں چھو سکتی ہے داماں تیرا

۲۸۔ ایطاء۔ جلی اور خفی دونوں

۲۹۔ طرح بہ سکون ثانی۔ مثلاً۔ ؎

کس طرح انھیں راہ پہ لاؤں یا رب

(وجہ ترک ایک تو یہ ہے کہ رے ساکن ہو۔ تو طرح کے معنی بنیاد ہیں۔ دوسرے یہ کہ بول چال میں سب رے کو متحرک بولتے ہیں)

۳۰۔ طرف بہ معنی سمت بہ سکون ثانی۔ وجہِ ترک یہ ہے کہ رے ساکن ہو تو طرف کے معنی گوشہ ہیں مثلاً طرفِ کلاہ۔ دوسرے یہ کہ بول چال میں سب رے کو متحرک بولتے ہیں۔

۳۱۔ اور کی جگہ ار (فع کے وزن پر)

۳۲۔ اس دم۔ جس دم۔ کس دم۔ بول چال میں شامل نہیں ہیں۔

۳۳۔ سوزش بہ معنی سوز۔ مثلاً اے سوزشِ الفت

۳۴۔ رہ بہ معنی راہ بغیر ترکیبِ فارسی مثلاً۔ ؎

نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

۳۵ - پیدائش بہ معنی ولادت ترکیبی صورت میں۔ مثلاً یومِ پیدائش

۳۶ - خُوباں۔ مُغاں۔ جَاناں بے ترکیب فارسی۔ مثلاً۔ ۶

۱۔ جاناں مرے مزار پہ آنا کبھی کبھی

۲۔ چھیڑ خُوباں سے چلی جائے اسد

۳۔ مُغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا

۳۷ - نشہ (فعلُن کے وزن پر) بغیر ترکیب فارسی۔ مثلاً۔ ۶

ہوگیا دل پہ مرے نشے کا عالم طاری (بول چال میں فعل ہی کے وزن پر بولتے ہیں)

۳۸ - صورت بہ معنی مانند بغیر ترکیب فارسی۔ مثلاً۔ ۶

۱۔ قدر پاتے ہیں جہاں میں وہ گہر کی صورت

۲۔ میری آنکھوں میں وہ پھرتے ہیں نظر کی صورت

۳۹ - انتظاری۔ انکساری (ی زائد ہے)۔

۴۰ - آن کر۔ آن گرا (نون زائد ہے)

۴۱ - وصلت بہ معنی وصل (ت زائد ہے)

۴۲ - وہاں پر۔ یہاں پر (پر زائد ہے)

۴۳۔ مشکور بہ معنی شاکر

۴۴۔ عاقبت بہ معنی آخر کار

۴۵۔ بٹھانا۔ پنھانا (نباہنا اور پہنانا کی جگہ)

۴۶۔ شکستِ ناروا

۴۷۔ تقابلِ ردیفین

۴۸۔ لُٹا کی ہے۔ اُٹھا کی ہے۔ ان میں کی بالتخفیف۔ مثلاً ؎

آدم کے وقت سے یہ برابر لُٹا کی ہے

۴۹۔ جا بہ معنی جگہ۔ ترکیبی صورت کے بغیر۔ مثلاً ؎

کیوں کر میں کہوں ملکِ عدم عیش کی جا ہے

اِس جا۔ اُس جا۔ کس جا۔ جس جا بھی اسی قبیل سے ہیں

۵۰۔ اس کے تئیں۔ اپنے تئیں

۵۱۔ غش بہ معنی غشی۔ مثلاً ؎

غش پہ غش طاری ہوا

۵۲۔ فارسی و عربی الفاظ کی جمع الجمع۔ مثلاً وجوہات۔ عرائضات

۵۳۔ بِن بہ معنی بغیر۔ مثلاً۔ بِن کہے بھی رہا نہیں جاتا۔

۵۴ - بچارا (بے چارہ کی جگہ)

۵۵ - چشمِ نم - نم بہ معنی تری درست ہے - بہ معنی تر درست نہیں - اس لئے چشمِ پُرنم کہنا درست ہوگا -

۵۶ - ہائے وائے فعلن کے وزن پر

۵۷ - تلے - مثلاً - ؎

مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

مگر محاورہ میں آتا ہو تو ناقابلِ ترک ہے - مثلاً پاؤں تلے کی زمین نکل گئی

۵۸ - دوگونہ - دوجہاں میں دو بہ وزن فع - مثلاً - ؎

۱ - ہر حال میں یہ عذاب دوگونہ ہے

۲ - میرے عصیاں پر کرم کر اے خدائے دوجہاں

(فارسی میں دو کی آواز ترکیبی صورت میں صرف دال مضموم ہے) مثلاً - ؎

غرض دوگونہ عذابست جانِ مجنوں را

۵۹ - جوں بہ معنی مانند

۶۰ - یا کہ - جو کہ (کاف زائد ہے)

۶۱ یونہیں - فعلن کے وزن پر

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اپنے کلام کو اَلوِداع

۶ جنوری ۱۹۵۱ء

اے عزیزانِ گرامی تم کو رُخصت آج سے
شوق سے جاؤ جہاں چاہو اجازت آج سے

میں نہیں سمجھوں گا تم کو اک امانت آج سے
چھوڑ دی اپنی بیاضوں کی حفاظت آج سے

گو مجھے احساس ہے ترکِ وفا کرتا ہوں میں
تم کو آغوشِ رفاقت سے جدا کرتا ہوں میں

لیکن اب بھی فرض اُلفت کا ادا کرتا ہوں میں
زندۂ جاوید رہنے کی دعا کرتا ہوں میں

اب تمھیں جانا پڑا اہلِ ہنر کے سامنے
اب تمھیں رہنا پڑا سب کی نظر کے سامنے

کور باطن ہی نہ بن جانا قمر کے سامنے
سنگ ریزہ ہی نہ ہو جانا گُہر کے سامنے

کہنے والے کی فضیلت اب تمھارے ہاتھ ہے
اُس کا درجہ اُس کی عظمت اب تمھارے ہاتھ ہے

حسنِ ظاہر کی بھی عزت اب تمھارے ہاتھ ہے
حسن باطن کی بھی وقعت اب تمھارے ہاتھ ہے

اے عزیزو اب خدا حافظ تمھیں کہنا پڑا
اب مجھے صدمہ تمھارے ہجر کا سہنا پڑا
اب تمھیں بھی میری صحبت سے الگ رہنا پڑا
اب مجھے بھی موجِ مُضطر کی طرح بہنا پڑا

میرے گھر کی جلوہ سامانی تمھارے دم سے تھی
ہر اندھیری رات نورانی تمھارے دم سے تھی
راحتِ دل کی فراوانی تمھارے دم سے تھی
ہر گراں جانی میں آسانی تمھارے دم سے تھی

کہہ نہیں سکتا کہ تم خوش رنگ یا بدرنگ ہو
گرم رفتاری بھی رکھتے ہو کہ پائے لنگ ہو
باعثِ توقیر ہو یا موجبِ صد ننگ ہو
دیدہ ور ہی کہہ سکیں گے لعل ہو یا سنگ ہو

دیکھنا دعوے نہ کرنا خوش بیانی کا کبھی
مُدّعی ہونا نہ اپنی تر زبانی کا کبھی
اِدّعا دل میں نہ رکھنا نکتہ دانی کا کبھی
مُرتکب ہونا نہ اپنی مدح خوانی کا کبھی

قابلِ تعریف ہو تو قدر داں مِل جائیں گے
لائقِ توصیف ہو تو مدح خواں مِل جائیں گے
تر زبانی کی ثنا کو تر زباں مِل جائیں گے
خوش بیانی کے بیاں کو خوش بیاں مِل جائیں گے

جانتے ہو اب یہ تم حسنِ بیاں کیا چیز ہے
ہرزہ گوئی اور فکرِ رائیگاں کیا چیز ہے
فارسیت ہو نہ جس میں وہ زباں کیا چیز ہے
شعرِ تر کیا چیز ہے طبعِ رواں کیا چیز ہے

چستِ بندش کا سبق میں نے پڑھایا تھا تمھیں
گُر فصاحت کا بلاغت کا بتایا تھا تمھیں
یاد رکھنا اُس ہنر کو جو سکھایا تھا تمھیں
یاد رکھنا اُس لہو کو جو پلایا تھا تمھیں

یاد رکھنا کس خزانے سے نکالا ہے تمھیں
یاد رکھنا کون سے سانچے میں ڈھالا ہے تمھیں
یاد رکھنا کس زبوں حالی سے پالا ہے تمھیں
یاد رکھنا کن سنبھالوں سے سنبھالا ہے تمھیں

یاد رکھنا تم جنابِ داغ کے احسان کو
یاد رکھنا اس جہاں اُستاد کے فیضان کو
یاد رکھنا اہلِ فن کی امتیازی شان کو
یاد رکھنا اپنے متروکات کے میدان کو

فہم کی بے مائیگی شرمندۂ تقصیر ہے
خندۂ اہلِ ہنر کا خوف دامن گیر ہے
مرحبا سُن لو تو یہ اک مفت کی توقیر ہے
داد پا جاؤ تو یہ اک خوبیِ تقدیر ہے

دُعَا

عبودیت پہ الٰہی مجھے بھی ناز رہے
جُھکا ہوا ترے در پر سرِ نیاز رہے
یہ آرزو ہے عطا کر مجھے وہ ذوقِ نظر
شہود و غیب میں باقی نہ امتیاز رہے

غزلیات

(۱)

چارۂ حالِ زار کیا معنی — جبر میں اختیار کیا معنی

راحت و رنج کیوں ہیں دوش بدوش — گُل کے پہلو میں خار کیا معنی

وہ کرم کر جسے دوام بھی ہو — زندگی مستعار کیا معنی

کیف آور تو ہے شراب فقط — ساغرِ زرنگار کیا معنی

چھیڑ ہے یہ قفس نصیبوں سے — مژدۂ نو بہار کیا معنی

کوششِ ترکِ عشق ہے بے سُود — اس نشے کا اُتار کیا معنی

کس گنہ گار کو یقین نہیں — اتنے قول و قرار کیا معنی

جنّت اک چیز ہی سہی لیکن — حشر تک انتظار کیا معنی

جس کے معنی ہیں بھی ونایت ہو — ایسی دنیا سے پیار کیا معنی

کیوں گِنے جاتے ہیں گناہ مرے — اَن گِنت کا شُمار کیا معنی

ہیں وہی بانیٔ ستم اے جوش — ستمِ روزگار کیا معنی

(۲)

دل پہ جو گزری کوئی کیا جانے — یہ تو ہم جانیں یا خدا جانے
خاک جھیلے گا وہ مصیبتِ عشق — جو لگا کر نہ پھر بجھا جانے
تو ہی اپنا مقام جانتا ہے — اک ظلوم و جہول کیا جانے
کیا کرے عرضِ مدعا وہ بشر — ابتدا کو جو انتہا جانے
دل کو کل تک تو چین حاصل تھا — آج کیا ہو گیا خدا جانے
بادہ نوشوں کا حشر کیا ہوگا — مجھ بلانوش کی بلا جانے
بات رندی کی مجھ کو آتی ہے — پارسائی کی پارسا جانے
تجھ کو اپنی خبر نہیں اے جوشؔ — تو خدائی کے راز کیا جانے

(۳)

مسرورِ دلِ زار کبھی ہو نہیں سکتا — یعنی ترا دیدار کبھی ہو نہیں سکتا
میں غیرِ وفادار کبھی ہو نہیں سکتا — اس سے تمہیں انکار کبھی ہو نہیں سکتا
سو راز ہر اک راز کے پردے میں ہیں پنہاں — دل محرمِ اسرار کبھی ہو نہیں سکتا
اب لطف و کرم پر بھی بھروسا نہیں اس کو — اچھا ترا بیمار کبھی ہو نہیں سکتا
اے شیخ اگر خلد کی تعریف یہی ہے — میں اس کا طلب گار کبھی ہو نہیں سکتا

اعمال کی پرسش نہ کرے داورِ محشر
مجبور تو مختار کبھی ہو نہیں سکتا

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی سہو ہوا ہو
میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

غم ہیں کہ دبائے ہی چلے جاتے ہیں مجھ کو
سر ہے کہ سبک سار کبھی ہو نہیں سکتا

اک میں کہ ترے جور سے فریاد بلب ہوں
اک تو کہ خطا وار کبھی ہو نہیں سکتا

آزارِ محبت ہی وہ آزار ہے اے جوش
جو باعثِ آزار کبھی ہو نہیں سکتا

(۴)

نظر نظر سے ملاؤ حجاب کیا معنی
نیازِ عشق سے یہ اجتناب کیا معنی

حریفِ قلقلِ مینا نہیں کوئی نغمہ
ملے شراب تو چنگ و رباب کیا معنی

چنیں گے ایک مجھی کو وہ ہر ستم کے لئے
خطا کرے نظرِ انتخاب کیا معنی

غرض ہی کیا تھی تماشائے دہر سے تم کو
اب آئے ہو تو یہ رُخ پر نقاب کیا معنی

وقارِ مہر و وفا کو تو سرنگوں نہ کرو
ہر اک سوال کا اُلٹا جواب کیا معنی

مری نظر ہی سے یہ احتیاط ہے ورنہ
نقاب کے لئے بندِ نقاب کیا معنی

بساطِ دہر اُلٹتی ہے تو اُلٹ جائے
ترے مزاج میں ہو انقلاب کیا معنی

حدِ شمار سے باہر ہیں جب گناہ مرے
حساب کے لئے یومِ حساب کیا معنی

کوئی بہانہ بگڑنے کا چاہیئے تم کو
ذرا سی بات پر اتنا عتاب کیا معنی

سکونِ دل تو جہاں میں کہیں نہیں اے جوشؔ　　پھر اس سکوں کے لئے اضطراب کیا معنی

(۵)

حسنِ مستور کو وہ کیا جانے　　بے حجابی کو جو پروا جانے
دیر پر بحث کرے بعد میں شیخ　　پہلے کعبے کو تو کعبا جانے
عشق تو جانتا ہے رتبۂ حسن　　حُسن بھی عشق کا رتبا جانے
اُس کی الفت مجھے تڑپاتی ہے　　جو تڑپنے کو تماشا جانے
اِک مرے شوقِ شہادت کے سو　　کون قاتل کو مسیحا جانے
عشق میں گرم روِ راہ طلب　　شام کیا جانے سحر کیا جانے
رہبری کیا وہ کرے گا اے خضر　　جو عدم کا بھی نہ رستا جانے
اب دعا سے بھی حذر ہے مجھ کو　　کیا سمجھ لیں وہ اسے کیا جانے
راز کو راز نہ سمجھو اے جوشؔ　　اور پھر جس کو زمانا جانے

(۶)

گردِ ملال دل پہ نمایاں ہے آج کل　　ہر ایک صبح شامِ غریباں ہے آج کل
جانِ عزیز پیکرِ حرماں ہے آج کل　　دل پائے مالِ گردشِ دوراں ہے آج کل
دورِ خزاں ہے سوکھ کے کانٹا ہوئے ہیں پھول　　اک خارزار صحنِ گلستاں ہے آج کل

ہوش و حواس کا غمِ فرقت ہیں ذکر کیا
شیرازۂ جنوں بھی پریشاں ہے آج کل

رنگِ چمن اُداس کبھی اس قدر نہ تھا
ہر ایک پھول دیدۂ حیراں ہے آج کل

گُل دستۂ خیال کی وہ بندشیں کہاں
دل کی طرح دماغ پریشاں ہے آج کل

جوشِ جنوں کی دست درازی نہ پوچھئے
صد چاک عمر کا بھی گریباں ہے آج کل

وہ شوق وہ خلوصِ محبّت کہیں نہیں
بے مایگیِ عشق فراواں ہے آج کل

اب وہ ہیں اور اُن کی تغافل شعاریاں
جو آرزو ہے سر بہ گریباں ہے آج کل

کچھ امتیازِ عشق و ہوس ہی نہیں رہا
دُنیائے حُسن خاک بداماں ہے آج کل

فطرت بھی انقلاب کے زیرِ اثر ہیں جوش
تاریکیوں کا نام چراغاں ہے آج کل

(۷)

بلائے غم سر سے کیا ٹلے گی الم سے کیا مخلصی ملے گی
غلط ہے اُمّید کا یہ کہنا ابھی ملے گی ابھی ملے گی

نہیں ملے گا تو اک مجھی کو خوشی کا مژدہ نہیں ملے گا
گلوں کو بھی دل کشی ملے گی چمن کو بھی تازگی ملے گی

خدا کی رحمت کو پارسا اب عذابِ دوزخ سمجھ رہے ہیں
اُنھیں گماں تک نہ تھا کہ جنت گناہ گاروں کو بھی ملے گی

سیاہیِ شامِ غم کا شکوہ نہیں ہے راہِ طلب میں واجب
یہی اندھیرا بنے گا رہبر اسی سے کچھ روشنی ملے گی

عدم بھی عالمِ جمود کا ہے نہ کوئی محفل نہ کوئی صحبت
ہمیں تو اب تک یہی یقیں تھا کہ مرگ سے زندگی ملے گی

متاعِ حُسنِ سخن کے جویا کریں نہ تکلیفِ جستجو کچھ
کہیں یہ دولت گڑی نہ ہوگی جہاں ملے گی پڑی ملے گی

خلوصِ اُلفت کی جو ش قیمت تمھیں جو اس وقت مل رہی ہے
کہیں بھی پوچھو یہی کہیں گے کہیں بھی جاؤ یہی ملے گی

(۸)

اُسی بے درد کو افسوس میں نے چارہ گر جانا
ہمیشہ میرے دردِ دل کو جس نے دردِ سر جانا

ہمیں تو اک نہ اِک دن ہجر میں جی سے گزرنا
مگر تم کو بتا جائیں گے کیا ہوتا ہے مرجانا

ادائے نازہی کے مختلف یہ دو کرشمے ہیں
ترا دل میں اُتر جانا مرا دل سے اُتر جانا

محبت کو ہم اک دریائے بے ساحل سمجھتے تھے
کنارہ اس کا گردابِ بلا میں ڈوب کر جانا

ہم ایسے پھیر میں یارب تری طاعت کریں کیونکر
کبھی ہم کو اِدھر آنا کبھی ہم کو اُدھر جانا

نئے جھگڑوں کی ہے بُنیاد بے بُنیاد ہستی
بڑا نافہم ہے جس نے یہ قصہ مختصر جانا

سکندر جب چلانا کام ہو کر یہ صدا آئی
جنابِ خضر کو تم نے کہاں کا معتبر جانا

یقینِ وعدۂ فردا سے کیوں دل کا بھرم کھوئیں
تمھیں تو حشر میں بھی اپنے وعدے سے مکر جانا

کرم میں بھی ستم کے سیکڑوں پہلو نکلتے ہیں
غلط کیا ہے اگر ہم نے تجھے بیداد گر جانا

نہ جانا اور کچھ اے جوشؔ ہم نے شعر کہہ کہہ کر
یہی جانا کہ اپنے عیب کو بھی اک ہنر جانا

(۹)

بے سود ارادہ مقتل کا بے کار رُعا مر جانے کی
موت اپنے وقت پر آئے گی بے وقت نہیں وہ آنے کی

ساون کی ہوا لائی ہے خبر گھن گھور گھٹا چھا جانے کی
مژدہ ہو تمھیں اے بادہ کشو رحمت نے سُنی مے خانے کی

اِک رنگ ہے اس میں عشرت کا اِک رنگ ہے اس میں حسرت کا
کچھ ہنستی ہے کچھ روتی ہے تصویر مرے ویرانے کی

جب غم کی راتیں کاٹی ہیں رو کر ہی سہی مر کر ہی سہی
دن حشر کا بھی کٹ جائے گا کچھ بات نہیں گھبرانے کی

وحشت پہ مری حیراں ہو کر سب خاک بسر یہ کہتے ہیں
ہاتوں میں بھی خاک اُڑانا ہے کیا بات ہے اس دیوانے کی

تقریر کو اب یہ اجازت وہ رُوداد محبت عرض کرے
خاموشی نے جو کچھ بھی کہا تمہید ہے اس افسانے کی

انجامِ بقا تو ظاہر ہے انجامِ بقا پر بحث نہ کر
ہر سانس خبر دیتی ہے تجھے ہستی کے ہوا ہو جانے کی

ہر پاک نظر کے رستے میں ایسے بھی مقام آجاتے ہیں
خواہش ہو فرشتوں کو بھی جہاں دامانِ ہوس پھیلانے کی

اب پست ہوا معیارِ سخن اب سرد ہوا بازارِ سخن
اے جوشؔ کوئی تدبیر کرو اس محفل کو گرمانے کی

(۱۰)

یہی عہد کر لیا ہے نہ ہلوں گا اب یہاں سے
یہ ملا ہے درس مجھ کو ترے سنگِ آستاں سے

کہیں آگ لگ نہ جائے مرے شعلۂ بیاں سے
جو گزر گئی ہے مجھ پر نہ سنو مری زباں سے

کبھی آئی ہے چمن میں تو کیا ہے طوف اسی کا
رہی برق کو عقیدت مری شاخِ آشیاں سے

وہ غلط بھی کچھ کہیں گے تو وہی بجا رہے گا
جو نکل گیا زباں سے وہ نکل گیا زباں سے

ترے غم میں سوزِ دل کی وہ شرر فشانیاں ہیں
کہ اثر بھی جل گیا ہے مری گرمیِ فغاں سے

مرے دل نے اور پردے جو اٹھا دیئے تو کیا ہے
ترا پردۂ جلالی نہ اٹھے گا درمیاں سے

شبِ غم میں وہ قلق تھا کہ گلہ رہا سحر تک
کبھی ضبط سے فغاں کو کبھی ضبط کو فغاں سے

نہ فنا سے اُنس ہم کو نہ بقا میں چین ہم کو
کبھی آ گئے وہاں سے کبھی چل دیئے یہاں سے

تجھے دیکھنے کا سودا تو جہان میں ہے سب کو
مگر آنکھ دیکھنے کی کوئی لائے گا کہاں سے

مرے کوچۂ طلب کو وہ شرف ہے تجھ سے حاصل
کہ خراج مانگتی ہے یہ زمین آسماں سے

ترا حال جوش سُن کر وہ کچھ اور مشتعل ہیں
یہ شرر ہوا ہے شعلہ تری گرمیٔ بیاں سے

(۱۱)

جہاں بھی حُسنِ دل آرا دکھا گیا کوئی
وہیں فریبِ تمنا میں آ گیا کوئی

نظر نظر میں تماشے دکھا دیئے ایسے
مجھے بھی ایک تماشا بنا گیا کوئی

دکھا کے شوخ نگاہی کا جلوۂ بے تاب
مری نظر کو تڑپنا سکھا گیا کوئی

نگاہِ مہر و محبت کا آج کیا کہنا
مرے مذاقِ تمنا پہ چھا گیا کوئی

نمودِ حُسن کو خلوت میں تھا قرار کہاں
تعینّات کی دُنیا میں آ گیا کوئی

اُمیدِ لُطف و کرم پر کیا وہ لطف و کرم
کہ زندگی کو تمنا بنا گیا کوئی

دیا وہ درد کہ تھی جس میں ایک لذّتِ خاص
ستم میں شانِ کرم بھی دکھا گیا کوئی

یہ معجزہ ہے کہ زندہ ہیں اب مرے ارماں
مرے ہوس کو بھی جینا سکھا گیا کوئی

حریصِ لُطف و کرم اس قدر نہ ہوا ے دل
بھرے پُرے تو خزانے لُٹا گیا کوئی

نقاب رُخ سے اُٹھا دی مگر کمال یہ ہے
مری نظر کا بھی پردہ اُٹھا گیا کوئی

یہ کیا ضرور کہ ظاہر ہو نام بھی اے جوشؔ
یہی کہو کہ غزل میں سما گیا کوئی

(۱۲)

اسی ڈھب سے ہو کام آسان اپنا
نکل جائے دَم بن کے ارمان اپنا

عنایت بہت ہو چکی زخمِ دل پر
اٹھا لو خدارا نمک دان اپنا

جنوں کے ہر انداز میں ہے تغزّل
یہ دیوانگی ہے کہ دیوان اپنا

یہیں سرفروشی کے جوہر کھُلیں گے
تمھارا ہی کوچہ ہے میدان اپنا

پریشاں ہے شیرازۂ زندگی بھی
فقط دل نہیں ہے پریشان اپنا

ابھی عرض کرتا ہوں رُوداد وحشت
ذرا چاک کر لوں گریبان اپنا

قسم ہے اسی حُسن کافر اَدا کی
تمھاری ہی اُلفت ہے ایمان اپنا

عدم کی مسافت ہو کیوں بار ہم کو
کفن کے سوا کیا ہے سامان اپنا

علاجِ جنوں ہیں محبت کی نظریں
رَفو ہو رہا ہے گریبان اپنا

خدا پر بھروسہ ہے اے جوشؔ اب بھی
وہی تھا وہی ہے نگہ بان اپنا

(۱۳)

اُن سے ہم ترکِ تغافل کا تقاضا نہ کریں
اس کا مطلب یہ کہ جینے کی تمنّا نہ کریں

وعدہ کر کے وہ اگر وعدے کو ایفا نہ کریں
اس سے بہتر تو یہی ہے کوئی وعدا نہ کریں

یہ تو اے شرطِ محبت کوئی انصاف نہیں
ہم تمنّا تو کریں عرضِ تمنّا نہ کریں

اُن سے توقیرِ محبت نہیں ہوتی نہ سہی
اتنی تحقیرِ محبّت بھی خدارا نہ کریں

زندگانی کا سہارا میں سمجھتا ہوں اُنھیں
جو مرے جان سے جانے کی بھی پروا نہ کریں

اُن کی عادت کہ وفاؤں پہ بھی ہوں چیں بہ جبیں
اپنی فطرت کہ جفاؤں کا بھی شکوا نہ کریں

ضبطِ اُلفت تو ہوا جاتا ہے اِک نشترِ غم
کیا کریں ہم اگر اظہارِ تمنّا نہ کریں

المدد اُن کی زباں پر بھی ہے اے گردشِ دہر
جن کو عادت تھی کہ احسان گوارا نہ کریں

وعدۂ حشر پہ بھی جوشؔ یہ شک ہے مجھ کو
کہیں ایسا نہ ہو وہ اس کو بھی ایفا نہ کریں

(۱۴)

بار ہے لُطف و عنایت تو جفا بھی نہ کریں
وہ بھلا کر نہیں سکتے تو بُرا بھی نہ کریں

لبِ تقریر ترے سامنے وا بھی نہ کریں
اس کا مطلب یہ کہ ہم شکرِ جفا بھی نہ کریں

در تک آنے کی اجازت بھی نہیں ملتی ہے
کیا تجھے لُطف کے محتاج صدا بھی نہ کریں

کہنے سننے کا یہ مفہوم بھی کتنا ہے عجیب
ہم کہے جائیں مگر آپ سُنا بھی نہ کریں

اس میں بھی اُن کو شکایت سی نظر آتی ہے
حکم دیتے ہیں کہ بیمار دعا بھی نہ کریں

میرے کمزور سے نالوں کا انھیں خوف ہو کیا
جن کے انداز کبھی خوفِ خدا بھی نہ کریں

آپ کے جور و ستم کا تو گِلہ چھوڑ دیا
کیا ہم اب اپنے مقدر کا گِلا بھی نہ کریں

اُن کے اندازِ تغافل سے یقیں ہے مجھ کو
دم پہ بن جائے تو پروا وہ ذرا بھی نہ کریں

اُن سے بے کار تو بیٹھا نہیں جاتا اے جوشؔ
جب وفا اُن کو نہ آئے تو جفا بھی نہ کریں

(۱۵)

زندگی کیوں نہ ہو لبِ فریاد
ایک دل وہ بھی خانماں برباد

پھر وہی نالہ پھر وہی فریاد
حیف ہے تجھ پر اے دلِ ناشاد

اس کے سُننے سے کیوں ہے عار تجھے
میری رُوداد ہے تری رُوداد

آنکھ کہتی ہے مشکلات کو دیکھ
شوق کہتا ہے ہرچہ بادا باد

جب بھی پیدا ہوئی تڑپ دل میں
سی دیئے ضبط نے لبِ فریاد

اُن کی آمد تھی یا قیامت تھی
اور بھی کر گئی مجھے برباد

لبِ اظہار کی ضرورت کیا
آپ ہوں اپنے درد کی فریاد

یاد رکھنا تو آپ بھول گئے
بھول جانا مگر ہے اب تک یاد

کیا کہوں اُس کی تمکنت اے جوشؔ
جس کی بے داد بھی ہو طالبِ داد

(۱۶)

حور و غلماں سے محبت مجھے منظور نہیں
تیرا کوچہ ہو تو جنّت بھی مجھے منظور نہیں

آپ کیا پوچھتے ہیں قیمتِ خودداریِ دل
سار ی دُنیا کی بھی دولت مجھے منظور نہیں

کیوں مرے جذبۂ معصوم کو دیتا ہے فریب
صاف کہ دے کہ محبت مجھے منظور نہیں

پارسائی پہ اگر ذکرِ خدا ہے موقوف
ایسی بے کیف عبادت مجھے منظور نہیں

بزم ہی میں نہیں دل میں بھی جگہ دو صاحب
یہ دکھاوے کی محبت مجھے منظور نہیں

کوہِ غم سر پہ اُٹھانا تو ہے منظور مگر
آپ کا بارِ امانت مجھے منظور نہیں

بیچنے کے لئے ہوتی ہے اگر طاعتِ حق
شیخ صاحب یہ تجارت مجھے منظور نہیں

ترکِ دُنیا بھی کروں ترکِ تمنا بھی کروں
توبہ توبہ یہ مصیبت مجھے منظور نہیں

مے کدے تک تو مرے ساتھ چلو حضرتِ جوشؔ
چند قدموں کی رفاقت مجھے منظور نہیں

(۱۷)

اِخفائے حال اب تو مصیبت ہے کم نہیں
وہ درد دل میں ہے جو قیامت ہے کم نہیں

اس کے فریبِ حُسن کا مارا ہوا ہوں میں
جس کی ادائے شرم شرارت ہے کم نہیں

ہر وقت التجائیں خدا کی جناب میں
کہتے ہیں جس کو عشق عبادت ہے کم نہیں

وہ مہرباں نہیں نہ سہی ملتفت تو ہیں
اُن کا ستم بھی اُن کی عنایت ہے کم نہیں

ہر وقت ہیں وہ چشمِ تصور کے سامنے
دُوری مری نگاہ میں قربت ہے کم نہیں

شکرِ ستم پہ اور ہوئیں بدگمانیاں
کہتے ہیں وہ کہ یہ بھی شکایت ہے کم نہیں

سارا زمانہ حُسن کا فرماں پذیر ہے
یہ چیز بھی جہاں میں حکومت سے کم نہیں

اپنوں کی دوستی نے سکھایا ہے یہ سبق
غیروں کی دشمنی بھی عنایت سے کم نہیں

کیوں حُسن ہی کو عشق نے آفت سمجھ لیا
اپنی جگہ تو عشق بھی آفت سے کم نہیں

اے جوشؔ کیا غرض مجھے حُور و قصور سے
میرا وطن مرے لئے جنت سے کم نہیں

(۱۸)

کیوں فلسفی کو غرّہ اپنے کمال پر ہے
جتنا وہ باخبر ہے اتنا ہی بے خبر ہے

کس سخت جاں پہ یارب صیّاد کی نظر ہے
خنجر بھی سان پر ہے ناوک بھی سان پر ہے

بد ذوقیِ جہاں سے خاموش ہو گئے سب
ہر طائرِ خوش الحاں منقار زیرِ پر ہے

تیرے جنوں زدوں کو ہر چیز سے ہے وحشت
ذوقِ فغاں بھی اُن کا بیگانۂ اثر ہے

دردِ دلِ حزیں بھی آفت سے کم نہیں تھا
اس پر یہ چارہ سازی ایک اور دردِ سر ہے

تھوڑا سا اور سن لو افسانۂ محبت
دو ہچکیوں میں اب تو قصّہ ہی مختصر ہے

تدبیر سے توقع پہلے ہی اُٹھ چکی تھی
تھا آہ پر بھروسا اب وہ بھی بے اثر ہے

اے طالبِ نظارہ ترکِ طلب تو کر لے
دامانِ آرزو بھی اک پردۂ نظر ہے

اے شیخ کس جگہ کو تیرا مقام سمجھیں
تو کچھ زمین پر ہے کچھ آسمان پر ہے

اے جوشؔ ہر زباں پر ہے نام خیر و شر کا
لیکن کوئی نہ سمجھا یہ خیر ہے وہ شر ہے

(١٩)

ایک سے ایک جُدا شکل و طبیعت دیکھی — میری آنکھوں نے ہر اک چیز میں وحدت دیکھی
سلسلۂ رنج و مصیبت کا نہ ٹوٹا اک دن — ہم نے ہر ایک سحر صبحِ قیامت دیکھی
ہو گیا آئینہ آئینِ زمانہ سارا — ہر بشر میں یہی مُنہ دیکھے کی اُلفت دیکھی
اُن کے تیروں سے تمنّا کو بھی دیکھا گُل رنگ — دل کے زخموں میں بھی رنگینیِ صحبت دیکھی
جلوہ آرا تجھے ہر دشت میں پایا ہم نے — ہر چمن میں تری ہنستی ہوئی صورت دیکھی
ہو گیا بے خودیِ شوق میں تیرا ہی یقیں — تیری صورت سے جو ملتی ہوئی صورت دیکھی
بھولی صورت ہی کو دل دے کے ہوئے ہم برباد — نہ مزاج آپ کا دیکھا نہ طبیعت دیکھی
خواہشِ لطف و کرم کا یہ کرم ہے اے جوشؔ — ایک راحت کے لئے لاکھ مصیبت دیکھی

(٢٠)

غم کی بھرمار ہوئی جاتی ہے — زندگی بار ہوئی جاتی ہے
یاد آتا ہے تبسّم اُن کا — سانس تلوار ہوئی جاتی ہے
جس محبّت پہ بھروسا تھا مجھے — اب وہ آزار ہوئی جاتی ہے
ناتوانی بھی ترے کوچے میں — پائے رفتار ہوئی جاتی ہے
جان بھی تن میں اب اے پردہ نشیں — شوقِ دیدار ہوئی جاتی ہے

بار ہے دل پہ ندامت اُن کی — جیت بھی ہار ہوئی جاتی ہے

ضبطِ غم کیا ہو کہ بے تابیٔ دل — لب اظہار ہوئی جاتی ہے

جلوۂ بام کو دیکھوں کیوں کر — آنکھ دیوار ہوئی جاتی ہے

سہل گوئی بھی غم و رنج میں جوشؔ — سخت دشوار ہوئی جاتی ہے

(۲۱)

مے کشو جام اُٹھا لو کہ گھٹائیں آئیں — اثر بو کہتی ہوئی سرد ہوائیں آئیں

عشق و اُلفت کی سزا مل گئی آخر مجھ کو — میرے آگے میری معصوم خطائیں آئیں

اب توجہ تو مرے حال پہ ہو جاتی ہے — شکر کرتا ہوں کہ اُس بُت کو جفائیں آئیں

خندہ زن داغِ معاصی پہ ہوئی جاتی ہے — لو مری شرمِ گنہ کو بھی ادائیں آئیں

وہی مرنے کی تمنا وہی جینے کی ہوس — نہ جفائیں تمہیں آئیں نہ وفائیں آئیں

پھر وہ آمادہ ہوئے مجھ پہ برسنے کے لئے — پھر مرے سر پہ مصیبت کی گھٹائیں آئیں

اس قدر جورِ حسیناں سے رہا خوف زدہ — حوریں آئیں تو میں سمجھا کہ بلائیں آئیں

کوہِ غم تھا مرا انعامِ محبت شاید — چار جانب سے اُٹھا لو کی صدائیں آئیں

ڈوبنے والی ہے کیا کشتیٔ اُمید اے جوشؔ

موج تڑپی لب ساحل پہ دعائیں آئیں

(۲۲)

داغِ غم داغِ الم داغِ تمنّا دل میں
اتنی شمعوں سے بھی رہتا ہے اندھیرا دل میں

اب بھی اک چشمِ کرم کی ہے تمنّا دل میں
ایک مدت سے یہ ارمان ہے دل کا دل میں

رنج۔ غم۔ درد۔ الم۔ یاس۔ تمنّا۔ حسرت
اک تری یاد کے ہونے سے ہے کیا کیا دل میں

اس قدر مجھ کو ستایا کہ بنا دی دم پر
کوئی دشمن ہے کہ ہے اُن کی تمنّا دل میں

حسرتِ دید کا اے مرگ بتا کچھ تو علاج
ایک مدت سے کھٹکتا ہے یہ کانٹا دل میں

مٹ کر اے داغِ محبت مجھے برباد نہ کر
نہ رہی تیری ضیا بھی تو رہا کیا دل میں

اُس کو منظور ہو یہ قیدِ تعین کیوں کر
چھپ کے بیٹھے گا نہ وہ انجمن آرا دل میں

عرشِ اعظم سے جو اُتری تھی پلا دی مجھ کو
آگئی موجِ دلِ ساقیِ دریا دل میں

اتنا بے صبر ہے اے صبر تو جا رخصت ہو
مر نہ جاؤں گا اگر تو نہ رہے گا دل میں

گھر میں بھی دل کی طرح منظرِ بربادی ہے
اے جنوں دل ہے یہ صحرا ہیں کہ صحرا دل میں

جس محبت پہ تمھیں ناز ہے اتنا اے جوش
اس کا انجام بھی تم نے کبھی سوچا دل میں

(۲۳)

مبادا وہ ہوں بدگماں آتے آتے
ارادہ بدل لیں یہاں آتے آتے

کسی مصلحت سے دُعا بن گئی ہے
مرے لب پہ میری فغاں آتے آتے

مری شوخ طبعی کا احسان مانو / تمھیں آگئیں شوخیاں آتے آتے
بھروسا نہیں کچھ بہارِ چمن کا / ذرا سیر کر لوں خزاں آتے آتے
مجھے رات بھر یاد کس نے کیا ہے / سحر ہو گئی ہچکیاں آتے آتے
اثر لے کے پلٹی تھیں میری دعائیں / کہاں رُک گیا کارواں آتے آتے
نکیرین ابھی مجھ کو معذور رکھیں / بہت تھک گیا ہوں یہاں آتے آتے
یہ ہے قولِ اُستادِ لے جوشؔ برحق / کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

(۲۴)

گو مر رہا ہوں پھر بھی جیئے جا رہا ہوں میں / وعدے پہ اعتبار کیئے جا رہا ہوں میں
خالی ہر ایک جام کیئے جا رہا ہوں میں / جی بھر گیا ہے پھر بھی پیئے جا رہا ہوں میں
یہ جانتا ہوں سعیِ رفو کارگر نہیں / پھر بھی جگر کا چاک سیئے جا رہا ہوں میں
کیوں کر کہوں کہ بانیِ بے داد کون ہے / تقدیر ہی کا نام لیئے جا رہا ہوں میں
یہ ظرفِ مے کشی کوئی دیکھے کہ بزم میں / غصہ بھی محتسب کا پیئے جا رہا ہوں میں
مطلب خدا سے مجھ کو نہ بُت سے کوئی غرض / اپنی ہی جستجو کے لیئے جا رہا ہوں میں
مقبول ہوں نہ ہوں یہ مقدر کی بات ہے / سجدے کسی کے در پہ کیئے جا رہا ہوں میں
جس موت پر ہو زندگیِ خضر بھی نثار / ارمان میں اسی کے جیئے جا رہا ہوں میں

دستِ جنوں ہے اور ہیں پردے مجاز کے — دُنیا کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
اے جوشِ ضبطِ آہِ جہاں سوز ہے محال — سچ تو یہ ہے کمال کئے جا رہا ہوں میں

(۲۵)

اتنا گُم راہ نہ کر ناصحِ ناداں مجھ کو — بڑھ کے ایماں سے ہے وہ دشمنِ ایماں مجھ کو
سوزشِ داغِ دروں سے نظر آتا ہے یہی — پھونک دے گا یہ چراغِ تہِ داماں مجھ کو
ہوسِ سیرِ گلستاں ہے خدا خیر کرے — خواب میں بھی نظر آتے ہیں بیاباں مجھ کو
اس کے چکّر میں بھی برباد ہوا جاتا ہوں — گردشِ جام بھی ہے گردشِ دوراں مجھ کو
گھر بیاباں میں بنایا تو یہ رُتبہ پایا — سر پہ دیتے ہیں جگہ خارِ مغیلاں مجھ کو
گرم اشکوں سے مرے دل کی لگی کیا بجھتی — کر گئے اور بھی یہ شعلہ بہ داماں مجھ کو
آج وہ شانِ کریمی ہیں دکھانے والے — کہیں رسوا نہ کرے تنگیٔ داماں مجھ کو
گھر سے وحشت میں نکلتا ہوں جو صحرا کی طرف — پاؤں پڑ پڑ کے مناتا ہے گریباں مجھ کو
کوئی ہم دم نہیں مُونس نہیں دم ساز نہیں — کس جگہ چھوڑ گئی عمرِ گریزاں مجھ کو
دولتِ کفر کی اُمّید نہ چھوڑوں گا کبھی — مل ہی جائے گا کوئی دشمنِ ایماں مجھ کو
اس کے چکّر میں دوبارہ تو ہیں آنے کا نہیں — ڈھونڈتی پھرتی ہے کیوں گردشِ دوراں مجھ کو
میرے اعمال ہوں سرسبز الٰہی کیوں کر — تُو نے پیدا ہی کیا سوختہ ساماں مجھ کو

ہوسِ جاہ رہی مانعِ طاعت اے جوشؔ　　سر و ساماں نے کیا بے سر و ساماں مجھ کو

(۲۶)

کشتِ اُمّید پہ دم بھر کبھی برسا ہی نہیں　　ابرِ رحمت کو مرے حال کی پروا ہی نہیں

عالمِ یاس میں باقی کوئی شکوا ہی نہیں　　اب تمنّا کے بر آنے کی تمنّا ہی نہیں

حق بہ جانب ہیں جو مرنے کے تمنّائی ہیں　　زندگی کا تو زمانے میں بھروسا ہی نہیں

میرے احباب بھی غافل ہیں مرے نالوں سے　　یا تو سُنتے ہی نہیں یا اُنھیں سُنتا ہی نہیں

جیتے جی کیا ہو رہا قیدیِ زندانِ اَلم　　جُز درِ موت نکل جانے کا رستا ہی نہیں

اِس ستم کو بھی کرم کہنے پہ مجبور ہوں میں　　وہ دیا درد کہ جس کا کوئی چارا ہی نہیں

لاکھ ہو باعثِ آزار جنونِ اُلفت　　حق تو یہ ہے کہ بغیر اس کے گزارا ہی نہیں

اپنے ناکامِ محبت پہ ہنسو گے کب تک　　درس عبرت بھی ہے وہ محض تماشا ہی نہیں

خواہشیں دل کی ہیں بے یادِ خدا محض ہوس　　انجمن کیا ہے اگر انجمن آرا ہی نہیں

مجھ سے کس بات پہ اُلجھیں گے حریفانِ سخن　　میں نے اُلجھا ہوا مضموں کبھی باندھا ہی نہیں

ہے بہ پردہ ترا اے شاہدِ معنی بے کار　　اب تو دُنیا میں ترا کوئی شناسا ہی نہیں

غم اگر مجھ سے تو میں غم سے ہوں مانُوس اے جوشؔ
اب یہ کانٹا مرے دل میں کبھی کھٹکا ہی نہیں

(۲۷)

کیوں ستاتی ہے غمِ دل کی فراوانی مجھے
چین لینے دے کبھی تو اے گرانجانی مجھے

اے زبانِ تیغ تجھ کو دستِ قاتل کی قسم
کچھ بتا تو ہی علاجِ دردِ پنہانی مجھے

وہ جنوں وہ جوشِ سودا اب کسی سر میں نہیں
ڈھونڈتی پھرتی ہے میری چاک دامانی مجھے

عالمِ حیرت میں آ کر اور بھی گم ہو گیا
اور پنہاں کر گئے اسرارِ پنہانی مجھے

قالبِ انساں میں بھی صدہا بلائیں چھپی ہیں
دیکھئے اب کیا دکھائے خانہ ویرانی مجھے

رُوح کا دل کا جگر کا رگ رگ سب جاتا رہا
راس آیا ہے قضا کے گھاٹ کا پانی مجھے

دیکھئے بدنام کرتی ہے کسے اے پند گو
تیری دانائی تجھے یا میری نادانی مجھے

تُو فنا کس کو کرے گی خود فنا ہو جائے گی
دھمکیاں اتنی نہ دے اے ہستیِ فانی مجھے

رازِ الفت کو بھی رُسوا کر دیا میری طرح
اور لے ڈوبی مرے اشکوں کی طغیانی مجھے

یا مری تقدیر جانے یا تری تیغِ جفا
اور ابھی پینا ہے کس کس گھاٹ کا پانی مجھے

اہلِ ہمت کی نگاہوں میں سُبک ہو جاؤں گا
اب اٹھانا ہی پڑا بارِ گراں جانی مجھے

آبِ خنجر سے بھی دل کی آگ بجھ سکتی نہیں
یہ ملی ہے کس بلا کی شعلہ سامانی مجھے

بے دلی جور و جفا سے تھی مگر اتنی کہاں
کھا گئی اُس خود پشیماں کی پشیمانی مجھے

بارشِ گل ہائے مضموں آج پھر ہوتی ہے جوش
پھر ستاتا ہے خیالِ تنگ دامانی مجھے

(۲۸)

جیتے جی میں کس طرح آزاد ہوں / آپ اپنی قید کی میعاد ہوں

بوئے گل بن کر ہوا کیا فائدہ / آہ اب بھی خانماں برباد ہوں

کیوں رگِ جاں تک نہ پہنچا کوئی تیر / شرم سارِ کوششِ صیّاد ہوں

آخری تعمیر بھی ناقص رہی / کہ گئی سب سے کہ بے بنیاد ہوں

ایک عالم تو عطا کر لے کریم / یہ بھی کیا کچھ قید کچھ آزاد ہوں

یاد کیا آئے دلِ برباد کی / اب تو میں خود ہی دلِ برباد ہوں

اور بھی اس شرم نے مارا مجھے / آپ کا بندہ ہوں پھر ناشاد ہوں

ملتفت اس پر تو ہو اے سنگ دل / عشق کی میں آخری فریاد ہوں

جوش اب دل خوگرِ غم ہو گیا / اپنی ناشادی پہ ہر دم شاد ہوں

(۲۹)

دم بھر نہ ٹھہرے سامنے آ کر چلے گئے / اک شعبدہ وہ مجھ کو دکھا کر چلے گئے

اس وہم سے کہ نیند میں آئے نہ کچھ خلل / احباب زیرِ خاک سُلا کر چلے گئے

تدبیرِ ضعفِ دل کی کسی سے نہ ہو سکی / سب اپنا اپنا زور لگا کر چلے گئے

آنے کو لاکھوں آئے بیاباں نوردِ عشق / دو روز خاک اُڑا ہی اُڑا کر چلے گئے

نابت قفس میں عہدِ عناصر نہ رہ سکا ۔۔۔ چاروں کے چاروں جان چھڑا کر چلے گئے
میرے چراغِ عمر سے روشن تھی بزمِ ناز ۔۔۔ سوجھی یہ کیا انھیں کہ بجھا کر چلے گئے
ہر شام پر گمان تھا صبحِ نشاط کا ۔۔۔ کیا دن تھے وہ خوشی کے جو آ کر چلے گئے
اک میں کہ انتظار میں گھڑیاں گنا کروں ۔۔۔ اک تم کہ مجھ سے آنکھ بچا کر چلے گئے
افسردگی مآل ہے اُن کا ہر التفات ۔۔۔ جب آئے دل میں آگ لگا کر چلے گئے
اے جوشؔ اب کہوں تو کہوں کس سے دردِ دل ۔۔۔ احباب اپنی اپنی سُنا کر چلے گئے

(۳۰)

بے فائدہ اے دل نہ ہو رو رو کے حزیں اور ۔۔۔ جز مرگ ترے درد کا چارہ ہی نہیں اور
موجود ہیں دُنیا میں بہت زہرہ جبیں اور ۔۔۔ لیکن نہیں تجھ سا کوئی غارت گرِ دیں اور
مرنا ہے یہاں زیست تو جینا ہے یہاں مرگ ۔۔۔ کوچے میں تمھارے ہے فلک اور زمیں اور
تاثیرِ فغاں یہ ہے کہ تنگ آ کے فغاں سے ۔۔۔ آمادۂ بے داد ہوا چرخِ بریں اور
ساقی مجھے اتنا بھی نہ باتوں میں جُھلا تُو ۔۔۔ شیشے میں نہیں اور تو خُم میں بھی نہیں اور
شاکر ہوں ترے حرفِ تسلّی کا میں لیکن ۔۔۔ ڈر ہے مجھے برباد نہ کر دے یہ کہیں اور
مارا ہے تمھیں نے مجھے لُوٹا ہے تمھیں نے ۔۔۔ انکار کے انداز سے ہوتا ہے یقیں اور
مے خانے کے در پر بھی ہوں مجبورِ عبادت ۔۔۔ کعبے کے لئے لاؤں کہاں سے میں جبیں اور

یہ کیا کہ ستم مجھ پہ تو غیروں پہ کرم ہوں
اک پھول کا ہو رنگ کہیں اور کہیں اور

آہوں سے بھی اے جوشؔ یہ ڈر ہے تپِ غم میں
خرمن کو مرے آگ لگا دیں نہ کہیں اور

(۳۱)

دلِ نافہم دستورِ جہاں سمجھا تو کیا سمجھا
بہارِ زندگی کو بے خزاں سمجھا تو کیا سمجھا

محبت میں کوئی سود و زیاں سمجھا تو کیا سمجھا
کسی نامہرباں کو مہرباں سمجھا تو کیا سمجھا

ترے وعدے کا شاکی ہاں کو ہاں سمجھا تو کیا سمجھا
دیارِ عشق و اُلفت کی زباں سمجھا تو کیا سمجھا

ادائے ناز اُن کی کہ رہی ہے نیم جانوں سے
قضا کو زندگی کا پاسباں سمجھا تو کیا سمجھا

بڑا نافہم نکلا عمر کھو دی خم نشینی میں
فلاطوں مدعائے کُن فکاں سمجھا تو کیا سمجھا

کبھی میرے بھی ظرفِ مے کشی کی داد دی ہوتی
مجھے کم نوش اے پیرِ مغاں سمجھا تو کیا سمجھا

مری چپ سے یقیں ترکِ اُلفت کر لیا تو نے
زبانِ بے زبانی کا بیاں سمجھا تو کیا سمجھا

تجلیِ رخِ تاباں نے پردے تان رکھے ہیں
مرادِ وقتِ نظر تجھ کو عیاں سمجھا تو کیا سمجھا

ٹھکانا ڈھونڈ لے مرغِ چمن خوش رنگ پھولوں میں
اگر تنکوں کو اپنا آشیاں سمجھا تو کیا سمجھا

تری چشمِ خرد کو نور بخشا جس تجلی نے
اسے اے فلسفی وہم و گماں سمجھا تو کیا سمجھا

مآلِ جور اے ظالم سمجھ لے حشر سے پہلے
یہاں سمجھا تو کچھ سمجھا وہاں سمجھا تو کیا سمجھا

نویدِ زندگی اے جوشؔ ہر اک سانس ہے مجھ کو
اسے بانگِ رحیلِ کارواں سمجھا تو کیا سمجھا

(۳۲)

دل میں بتوں کا نقش بٹھایا نہیں ہنوز
کعبے کو ہم نے دَیر بنایا نہیں ہنوز

مدّت ہوئی کہ بابِ اثر بند ہو گیا
میں نے دعا سے ہاتھ اُٹھایا نہیں ہنوز

جو کہ سکیں نہ ہم وہ کہا ہی نہیں ابھی
جو سُن سکو نہ تم وہ سنایا نہیں ہنوز

شوقِ کمال اے دلِ ناکام کیا کرے
تو نے کمالِ شوق دکھایا نہیں ہنوز

ہم آور رہِ دل کے لئے چارہ سازیاں
یہ روگ اپنے جی کو لگایا نہیں ہنوز

دامن چھڑاؤں پرسشِ محشر سے کس طرح
میں نے تو داغِ مے بھی چھڑایا نہیں ہنوز

ساقی خدا کرے کہ مجھی کو عطا کرے
وہ جام جو کسی کو پلایا نہیں ہنوز

سو پردوں میں بھی شوقِ تماشا ہو کامیاب
آنکھوں نے یہ کمال دکھایا نہیں ہنوز

بے رنگیٔ جہاں کا ہو نقش استوار کیا
وارفتگی نے رنگ جمایا نہیں ہنوز

تمہید ہی سے آپ تو بیزار ہو گئے
سُننا جو چاہیئے وہ سُنایا نہیں ہنوز

اے جوؔش شکر کر کہ یگانوں کے جَور نے
بے گانۂ حواس بنایا نہیں ہنوز

(۳۳)

بلا سے کوئی ہاتھ مَلتا رہے
ترا حُسن سانچے میں ڈھلتا رہے

ہر اک دل میں چمکے محبت کا داغ
یہ سکّہ زمانے میں چلتا رہے

وہ ہمدرد کیا جس کی ہر بات میں — شکایت کا پہلو نکلتا رہے
بدل جائے خود بھی تو حیرت ہے کیا — جو ہر روز وعدے بدلتا رہے
مری بے قراری پہ کہتے ہیں وہ — نکلتا ہے دم تو نکلتا رہے
پلائی ہے ساقی جو آنکھوں سے آج — اِسی کا بس اب دَور چلتا رہے
تمھیں ہم سحابِ کرم بھی کہیں — اُمیدوں کا خرمن بھی جلتا رہے
یہ طُولِ سفر یہ نشیب و فراز — مسافر کہاں تک سنبھلتا رہے
زمانہ ہی بدلے تو کیا فائدہ — مقدّر بھی کچھ کچھ بدلتا رہے
کوئی جوہری جوشش ہو یا نہ ہو — سخن ور جواہر اُگلتا رہے

(۳۴)

عالمِ جلوت میں وہ خلوت مقام آ ہی گیا — خاصِ بخشش کو خیالِ فیضِ عام آ ہی گیا
صبر سے تسکیں نہ تھی لیکن وہ کام آ ہی گیا — آتے آتے مجھ تک آخر دورِ جام آ ہی گیا
جذبِ دل نے داد لے لی اس تغافل کیش سے — جس کو میں ناکام سمجھا تھا وہ کام آ ہی گیا
گو دلِ بے تاب کے پائے طلب شل ہو گئے — اپنی منزل پر مگر یہ سست گام آ ہی گیا
ناخدا کی احتیاطیں رائگاں ثابت ہوئیں — جس جگہ دل ڈوب جائے وہ مقام آ ہی گیا
میرا شکوہ ہی سہی میری مذمت ہی سہی — خوش ہوں ہیں اُن کی زباں پر میرا نام آ ہی گیا

دیکھئے کس کس کا باغِ آرزو پامال ہو
اپنی ضد پر آج وہ محشر خرام آ ہی گیا

عقل بھی رکھتا تھا آنکھیں بھی پر پرواز بھی
پھر یہ کیا سوجھی کہ طائر زیرِ دام آ ہی گیا

طُور کی اب کچھ تمنا ہے نہ برقِ طور کی
جس کے ہم طالب تھے وہ بالائے بام آ ہی گیا

جس جگہ آکر فرشتے بھی پھسل جاتے ہیں جوشؔ
لیجئے حضرت سنبھلئے وہ مقام آ ہی گیا

(۳۵)

برگشتہ دل نہ ہوں گے تمھاری جفا سے ہم
جب تک ہے تن میں جان لڑیں گے قضا سے ہم

طولِ سفر نے دونوں کو حیران کر دیا
ہم سے تو رہ نما ہے خفا رہ نما سے ہم

اتنی خوشی ہوئی ہے ترے التفات کی
عمرِ گزشتہ مانگ رہے ہیں خدا سے ہم

اے آمدِ سحر تری عجلت کو کیا کہوں
لائے تھے اُن کو گھر میں بڑی التجا سے ہم

جز اشک و آہ تجھ میں ہے کیا اے دیارِ عشق
بے زار ہو گئے تری آب و ہوا سے ہم

روشن تو ہو چلی تھی قفس میں بھی زندگی
پھر بجھ کے رہ گئے ہیں چمن کی ہوا سے ہم

ہر جادہ رہ گزر ہے تری جائیں کس طرف
حیران ہو گئے ہیں ترے نقشِ پا سے ہم

اچھی تھی اس جمود سے دُنیائے آرزو
بے زار کیوں نہ ہوں دلِ بے مدعا سے ہم

ہوتا نہ جرمِ عشق نہ ہوتے وہ ملتفت
خوش ہو رہے ہیں اپنے کئے کی سزا سے ہم

جینے کی کچھ خوشی ہے نہ مرنے کا غم ہے جوشؔ
رہتے ہیں بے نیازِ بقا و فنا سے ہم

(۳۶)

ایک بھی پایا نہ راحت کا مکاں میرے لئے
ٹھوکریں کھاتی پھری عمرِ رواں میرے لئے

دردِ غم میرے لئے آہ و فغاں میرے لئے
ہے ترے گھر میں یہی اے آسماں میرے لئے

شوقِ اُلفت ہی نہیں ہے جاں ستاں میرے لئے
ترکِ اُلفت بھی ہے مرگِ ناگہاں میرے لئے

ہے اگر راہِ طلب تاریک تو پروا نہیں
مشعلیں روشن کریں گی بجلیاں میرے لئے

کوئی دیکھے تو مرے کیفِ نظر کی وسعتیں
سات مے خانے ہیں ساتوں آسماں میرے لئے

اس قدر بھی کیا کہ جس سے ہوش کھو بیٹھے کوئی
بس یہی کافی ہے اے پیرِ مغاں میرے لئے

داد دیتا ہوں تجھے یا رب میں اس تخصیص کی
مہرباں سب کے لئے نامہرباں میرے لئے

سایہ افگن ہو گیا ہے تو جفا بھی ترک کر
اور بھی تھوڑا سا جھک آ آسماں میرے لئے

موسمِ گل ہی پہ تھی موقوف فکرِ آشیاں
اب تو ہر اُجڑا چمن ہے آشیاں میرے لئے

جز غمِ اُلفت نہیں ہے کوئی بھی پرسانِ حال
آں جہانی ہو گیا سارا جہاں میرے لئے

رحم کچھ آیا تو ہے اُن کو مری اُفتاد پر
ایک گردش اور بھی اے آسماں میرے لئے

دو قدم چلنا بھی اب راہِ طلب میں ہے محال
ناتوانی بن گئی بارِ گراں میرے لئے

گلشنِ فردوس سے اے جوشؔ مجھ کو کیا غرض
کم نہیں اُس سے مرا ہندوستاں میرے لئے

(۳۷)

مجھ کو لینے کے لئے بے تاب ہر ویرانہ تھا
پاؤں کا چکر بھی گویا گردشِ پیمانہ تھا

اُس کے ہوتے میں نہ محتاجِ خُم و خُمخانہ تھا
تیرا پیمانِ وفا میرے لئے پیمانہ تھا

حشر میں تھا نامۂ اعمال سب کے ہاتھ میں
میرے ہاتھوں میں مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

تجھ سے بھی کچھ بڑھ کے تھیں تیری تمنائیں حسین
سیکڑوں پریوں کے جھرمٹ میں ترا دیوانہ تھا

چھین لی کیوں آپ نے مجھ سے متاعِ صبر و ہوش
کیا سزائے قیدِ غم کے ساتھ کچھ جرمانہ تھا

جل بجھا وہ شمع پر میں مر مٹا اس رشک میں
موت پروانے کی تھی یا موت کا پروانہ تھا

داستانِ عاشقی کچھ اور باقی ہے ابھی
خوابِ ہستی تو فقط افسانہ در افسانہ تھا

چار دن چلنے نہ پایا بادۂ عشرت کا دُور
ہائے کتنا تنگ میری عمر کا پیمانہ تھا

جوشؔ کا کچھ ذکر سُن پایا تو بولے کون جوشؔ
کیا وہی جو شہر بھر میں ایک ہی دیوانہ تھا

(۳۸)

لا اور بھی اک جام کہ آئی ہیں گھٹائیں
اے ساقیِ مے خانہ تری دُور بلائیں

پی لو گے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے
ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنّت کی ہوائیں

دشمن ہی نہیں میں اُنھیں قاتل بھی کہوں گا
ہیں جن کی زباں پر مرے جینے کی دعائیں

دو چار جگہ خطِ جلی میں جو لکھی ہیں
وہ دفترِ عصیاں میں ہیں میری ہی خطائیں

قمری کی ہو فریاد کہ بلبل کا ہو نغمہ
دونوں ہیں مرے سازِ محبّت کی صدائیں

پرسش ہے بشر کی سرِ محشر تو انھیں سے
حق یہ ہے کہ اعمال کی زینت ہیں خطائیں

ناوک اُنھیں درکار نہ خنجر کی ضرورت
قاتل سے بھی کچھ بڑھ کے ہیں قاتل کی ادائیں

کرتی ہے ادب برقِ سرِ طور بھی اُن کا
گرما گئیں جن کو ترے کوچے کی ہوائیں

اے جوشؔ جفاؤں کا تو شکوہ نہیں مجھ کو
دشمن ہیں مری جان کی میری ہی وفائیں

(۳۹)

بحث میں دونوں کو لطف آتا رہا
مجھ کو دل میں دل کو سمجھاتا رہا

اُن کی محفل میں دلِ پُر اضطراب
ایک شعلہ تھا جو تھرّاتا رہا

موت کے دھوکے میں ہم کیوں آ گئے
زندگی کا بھی مزا جاتا رہا

ناشگفتہ ہی رہی دل کی کلی
موسمِ گل بار ہا آتا رہا

جب سے تُو نے دشمنی کی اختیار
اعتبارِ دوستی جاتا رہا

اپنی ہی ضد کی دلِ بے تاب نے
اُن کے در تک بھی میں سمجھاتا رہا

جور تو اے جوشؔ آخر جور تھے
لطف بھی اُن کا ستم ڈھاتا رہا

(۴۰)

حسنِ ساقی کیا مئے پُر جوش ہے
انجمن کی انجمن بے ہوش ہے

اک جہاں ہو جس کا مشتاقِ جمال — سخت حیرت ہے وہ کیوں رُوپوش ہے
شوق کا معیار کس سے پوچھئے — طُور کا شعلہ بھی اب خاموش ہے
زندگی ہیں کیا سبک دوشی ملے — زندگی تو خود ہی بارِ دوش ہے
اللہ اللہ منظرِ برقِ جمال — دیکھتی ہے آنکھ لب خاموش ہے
ساغرِ ہاتھ سے چھُوٹا نہیں — میری بے ہوشی جوابِ ہوش ہے
آبِ کوثر جوش ہو جس پر فدا — وہ مرا اشکِ ندامت کوش ہے

(۱۴)

ہر اک شمع ہے انجمن کے لئے — سب اہلِ وطن ہیں وطن کے لئے
نہ رکھ پاس کوڑی کفن کے لئے — خزانے لُٹا دے وطن کے لئے
وہی نبض ہے زندگی کا نشاں — تڑپتی رہے جو وطن کے لئے
ڈھل آئے ہیں آنکھوں سے کچھ اشکِ غم — یہ موتی ہیں تحفہ وطن کے لئے
مصیبت ہے تیرا یہ خوابِ گراں — نہ ہو بارِ خاطر وطن کے لئے
وطن کی غریبی پہ نالاں نہ ہو — خزانہ ہے تُو خود وطن کے لئے
ضرورت نہیں تجھ کو دستار کی — کفن باندھ اپنے وطن کے لئے
وطن ہے جو تیرے لئے اے عزیز — تری جان بھی ہے وطن کے لئے

اسی موت میں ہیں مسیحائیاں
مبارک ہے مرنا وطن کے لئے
اگر تیغ رکھتے نہیں جوشؔ تم
قلم ہاتھ میں لو وطن کے لئے

(۴۲)

شوقِ نظارہ کو تڑپایا تھا کس نے آپ نے
پردے پردے میں ستم ڈھایا تھا کس نے آپ نے
آرزوئے دل کو ٹھکرایا تھا کس نے آپ نے
اس کو برسوں خون رُلوایا تھا کس نے آپ نے
اب مرے سوزِ محبت سے بے زاری ہے کیوں
پہلے اس شعلے کو بھڑکایا تھا کس نے آپ نے
آپ ہی کو کھولنے ہوں گے مری قسمت کے پیچ
رشتۂ الفت کو اُلجھایا تھا کس نے آپ نے
ہر خوشی قربان کی تھی میں نے کس پر آپ پر
میری ہر خواہش کو ٹھکرایا تھا کس نے آپ نے
آپ ہی کی یاد تھی جس کے لئے تسکینِ دل
اس کی اُمیدوں کو تڑپایا تھا کس نے آپ نے
میری عرضِ مدعا کو التجائے شوق کو
قابلِ تعزیر ٹھہرایا تھا کس نے آپ نے
معترف جس کی وفا کے ہیں جنابِ جوشؔ بھی
آج اس کو یاد فرمایا تھا کس نے آپ نے

(۴۳)

سوزِ غم میں دیدۂ تر کام آسکتا نہیں
یہ وہ آتش ہے جسے پانی بجھا سکتا نہیں
منظرِ تصویرِ دردِ دل مٹا سکتا نہیں
آئینہ پانی تو رکھتا ہے پلا سکتا نہیں
کیا کرامت ہے وہ آنکھوں میں سمٹ کر آ گیا
وسعتِ ارض و سما میں جو سما سکتا نہیں

وہ بہاریں تیرے جلووں میں ہیں جن کے سامنے — گلشنِ جنّت بھی رنگ اپنا جما سکتا نہیں

خاک پر سب کو سُلا کر تیغِ قاتل کہ گئی — اب انھیں شورِ قیامت بھی اُٹھا سکتا نہیں

جب مقدّر میں یہی کچھ ہو تو شکوہ کیا کریں — تم نے جو لکھا ہے اُس پر حرف آ سکتا نہیں

آہ اس بے درد کی اُلفت میں ہوں آتش بجاں — جو لگا سکتا تو ہے لیکن بجھا سکتا نہیں

میری رُسوائی کا حال اے داورِ محشر نہ پوچھ — میں بھری محفل میں یہ قصہ سُنا سکتا نہیں

رفتہ رفتہ کر سکو گے جوشؔ ترکِ شاعری — عمر بھر کا روگ دو دن میں تو جا سکتا نہیں

(۴۴)

جوشِ وحشت کا ہوا یہ مرے افسانے سے — شہر کے شہر نظر آتے ہیں ویرانے سے

کشتیِ مے کا خدا پار لگائے بیڑا — بہ گئے کیف کے دریا مرے پیمانے سے

کون آیا تھا بلا نوش یہاں اے ساقی — توبہ توبہ کی صدا آتی ہے مے خانے سے

یہ کشش اُس کی ہمہ گیر محبت سے ہوئی — لاگ پتھر کو نہ تھی کچھ ترے دیوانے سے

اس قدر بیٹھ گئی گردِ نمودِ ہستی — اک بگولا بھی نہ اُٹھا مرے ویرانے سے

عجز نے مستِ رعونت مجھے ہونے نہ دیا — یہ وہ مے ہے جو نہ چھلکی کبھی پیمانے سے

پھر کوئی برقِ بلا اس پہ گری ہے شاید — پھر دھواں اٹھا ہے اُجڑے ہوئے کاشانے سے

دل کو تھی جس کی طلب دل ہی میں پایا اُس کو — اب حرم سے کوئی مطلب ہے نہ بُت خانے سے

اس قدر سوزِ محبّت نے بنایا محسود — شمع خود جل گئی جلتے ہوئے پروانے سے
اور دم بھر ابھی اس شغل میں رہیے مصروف — ٹوٹ جائے گا نہ پیماں کوئی پیمانے سے
حضرتِ جوشؔ جو کل ہی توہوئے توبہ شکن — سُنتے ہیں آج نکالے گئے مے خانے سے

(۴۵)

اُنھیں کے دیدۂ باطن کو روشن ہم سمجھتے ہیں — ہراک صبحِ مسرت کو جو شامِ غم سمجھتے ہیں
خوشی بھی سامنے آئے تو اس کو غم سمجھتے ہیں — فلاطوں جس حقیقت کو نہ سمجھے ہم سمجھتے ہیں
کہوں شرحِ جنوں کیوں کر خردمندوں کی محفل میں — یہ وہ نکتے ہیں جن کو اہلِ دانش کم سمجھتے ہیں
خموشی چھوڑ دے طرزِ بیاں تبدیل کرلے دل — زبانِ بے زبانی کو وہ شاید کم سمجھتے ہیں
شبِ تاریکِ غم میں زندگی کا ہے یقیں کس کو — صفِ انجم کو ہم اپنی صفِ ماتم سمجھتے ہیں
پریشانیِ غم کا سلسلہ اتنا ہے طُولانی — کہ ہم اس کو جوابِ کاکُلِ برہم سمجھتے ہیں
ہمارے عشق نے مفہوم لفظوں کا بدل ڈالا — بناوی جس نے دم پر ہم اُسے ہمدم سمجھتے ہیں
جلاکر خاک کردے گی سکوں کو عیش و راحت کو — تمھاری سرد مہری کو ہم آتش دم سمجھتے ہیں
ہُوئے جو خُوگرِ غم عیش کا اُن پر اثر کیا ہو — خوشی کو وہ خوشی سمجھیں جو غم کو غم سمجھتے ہیں

کلامِ جوشؔ میں رنگ اس قدر ہو یاس و حسرت کا
اسے بھی تو ہم اک نیرنگیِ عالم سمجھتے ہیں

(۴۶)

نگہِ ناز پہ قربان ہے خلقت کیسی
ہر جگہ ہوتی ہے اس جور کی عزت کیسی

تجھ سا دشمن بھی کوئی اور نہ ہوگا اے دل
ڈال دی تو نے مری جان پر آفت کیسی

کہیں دریائے محبت ہی نہ طوفانی ہو
ڈُوبی جاتی ہے مری آج طبیعت کیسی

سیدھے منہ بات بھی کرتے نہ سُنا ہم نے کبھی
حُسن والوں کی بگڑ جاتی ہے عادت کیسی

مجھ پہ دنیا میں قیامت رہی برپا ہر روز
اور اے داورِ محشر یہ قیامت کیسی

کیا غضب ہے کہ تصور میں بھی تاریکی ہے
چھا گئی مجھ پہ بلائے شبِ فرقت کیسی

حاصل اس شوقِ ریاضت کا بتا اے زاہد
مول لے رکھی ہے تو نے یہ مصیبت کیسی

شوخ طبعی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو
درِ دوزخ پہ بھی رو کے گئے جنت کیسی

جان دے کر بھی رسائی کی نہیں ہے امّید
آہ دشوار ہے یہ منزلِ الفت کیسی

زندگی پا گئی ہر ایک تمنا اے جوش
کر گیا تیرِ نگہ آج کرامت کیسی

(۴۷)

کیوں وہ پوچھیں کہ سبب نالۂ غم کا کیا ہے
دام کو مرغِ گرفتاری کی پروا کیا ہے

بُت کدے ہی میں حرم کو کوئی لا کر رکھ دے
آئے دن شیخ و برہمن میں یہ جھگڑا کیا ہے

آئینہ دیکھ کے تم عکس سے کیا پوچھتے ہو
مجھ سے پوچھو کہ تمہارا رُخِ زیبا کیا ہے

اک زمانہ ہے ترے جور سے فریاد بہ لب — کس سے پوچھوں کہ مرے درد کا چارا کیا ہے

دن کو تارے تو مقدّر نے دکھائے مجھ کو — پھر بھی آتی ہیں صدائیں ابھی دیکھا کیا ہے

مجھ کو اس طرزِ تغافل پہ خفا ہونا تھا — اُلٹے تم مجھ پہ خفا ہو یہ تماشا کیا ہے

جس کی رحمت پہ بھروسا ہے تجھے اے ناصح — میں بھی بندہ ہوں اسی کا مجھے سمجھا کیا ہے

نہ کھلیں گے مرے لب عرضِ تمنّا کے لئے — مجھ سے جب تک وہ نہ پوچھیں کہ تمنّا کیا ہے

شکرِ نعمت کے لئے خُلد میں آنا ہی پڑا — ورنہ اس گلشنِ بے کیف میں رکھا کیا ہے

بندۂ عیش و مسرّت کو خبر کیا اس کی — غم زدے ہی یہ بتائیں گے کہ دُنیا کیا ہے

خود وہ صیّاد بھی ہو صید بھی ہو دام بھی ہو — کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ معمّا کیا ہے

کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی اے جوشؔ — کون جانے مری تقدیر میں لکھا کیا ہے

(۴۸)

طریقِ عشق میں مشکل پہ مشکل کا گماں کب تک — یہ سودا ہے تو پھر اندیشۂ سود و زیاں کب تک

خدا جانے رہے گی بے اثر آہ و فغاں کب تک — قیامت ڈھائے گی مجھ پر جفائے آسماں کب تک

پرِ پرواز بھی حق نے دیئے ہیں نو بہاروں کو — نگہ بانی چمن کی کر سکے گا باغباں کب تک

لبِ تقریر سے کچھ کم نہیں میری خموشی بھی — سُنے گا سُننے والا دردِ دل کی داستاں کب تک

قدم اُٹھتے بھی ہیں تو ضعف سے دل بیٹھ جاتا ہے — چلیں گے ساتھ لے کر مجھ کو اہلِ کارواں کب تک

جفا ہم جھیل لیں گے ہر طرح کے جَور سہ لیں گے — اگر اتنا بتا دیں وہ کہ ہے یہ امتحاں کب تک

بہارِ زندگانی کی نہ کر تحقیر اے ناداں — خزاں دیدہ چمن زاروں میں طرحِ آشیاں کب تک

رگِ گل حسن کی زنجیرِ پا تو ہو نہیں سکتی — رہے گا پتّیوں میں قیدِ رنگِ گلستاں کب تک

خدا کے واسطے بے ربط باتوں میں نہ اُلجھاؤ — سوال از آسماں کب تک جواب از ریسماں کب تک

خدا کو سونپ دو اے جوشؔ پُشتارہ گناہوں کا — چلو گے اپنے سر پہ رکھ کے یہ بارِ گراں کب تک

(۴۹)

کون تھا عشقِ بتاں میں جو دل آزار نہ تھا — ایک پھندا تھا گلے میں مرے زنّار نہ تھا

وحشتِ دل ترے کوچے میں سوا ہوتی تھی — مجھ کو آسیب سے کم سایۂ دیوار نہ تھا

سو حیاتِ ابدی مرگ پہ کر دوں قربان — قتل کے بعد ہی کہہ دو کہ گنہ گار نہ تھا

بند کیوں ہو گئیں آنکھوں کی دُکانیں یارب — میں ابھی گرمیِ بازار سے بے زار نہ تھا

خوگرِ جَور کو غصّے ہی میں ہے لطفِ حیات — ورنہ رُوٹھے کو منانا مجھے دشوار نہ تھا

کر گئی موت مجھے اور بھی رُسوائے جہاں — اُس نے الزام یہ رکھا کہ وفادار نہ تھا

اے دُرِ اشک تری قدر یہاں کیا ہوتی — کوچۂ چاکِ گریباں کوئی بازار نہ تھا

ذرّے ذرّے کی نظر ہے دلِ مشتاقِ جمال — ایک موسیٰ ہی ترا طالبِ دیدار نہ تھا

کیوں اسے چاک کیا دستِ خزاں نے اے جوشؔ — دفترِ گُل تھا کوئی دفترِ اشعار نہ تھا

(۵۰)

یاس کے عالم میں نکلا دل سے نالا ایک اور — میرے ضبطِ راز پر الزام آیا ایک اور

حُسن کی دُنیا میں دیکھی ہم نے دُنیا ایک اور — رُوئے زیبا میں نہاں تھا رُوئے زیبا ایک اور

بزمِ ساقی میں بھی کوئی حرص سے خالی نہیں — ایک ساغر پی کے ہر مے خوار بولا ایک اور

جب کوئی غنچہ کھلا رو رو کے بلبل نے کہا — جان کا دشمن ہوا گلشن میں پیدا ایک اور

قیس کے دل کی تمنّا حُسن میں کچھ کم نہیں — جلوہ گر ہے سامنے لیلا کے لیلا ایک اور

عشق نے ہم کو زیارت گاہِ عالم کر دیا — گردِ غم سے ہو گیا تعمیر کعبا ایک اور

حشر کا اے حضرتِ واعظ یہی مفہوم ہے — زندگی کے بعد دیکھیں گے تماشا ایک اور

اب ذرا سی رہ گئی سدِّ رمق اے تیغ زن — میں ترے ہاتھوں کے صدقے ہاتھ ایسا ایک اور

بحرِ غم کی گود خالی ہم نے دیکھی ہی نہیں — ایک اگر منجدھار سے نکلا تو ڈوبا ایک اور

کیوں چلے صحرا کی جانب جوشش اس وحشت میں تم — کیا تمھارے دل میں چمکا داغِ سودا ایک اور

(۵۱)

کیسی خوشی خوشی کی تو اُمیّد بھی نہیں — وہ زندگی ہے جس میں کوئی زندگی نہیں

یہ اعتبارِ حُسن بھی ہے حسنِ اعتبار — دل دے چکا ہوں اُن کو مگر بے دلی نہیں

مشکل جو آپڑی ہے وہ آسان ہو سکے — مشکل اگر نہیں یہ تو آسان بھی نہیں

دل کی تڑپ ہی تھی مرا سرمایۂ حیات
افسردگی میں وہ بھی کبھی ہے کبھی نہیں

اس تند خُو سے شکوۂ بے داد کیا کروں
کچھ اپنی جان سے تو مجھے دشمنی نہیں

مجھ ناتواں کی بات میں تاب و تواں کہاں
سب سُن چکے ہیں چوٹ کسی کو لگی نہیں

باندھے تھے جو طلسم وہ سب محو ہو گئے
ایک آرزو ہے وہ بھی کبھی ہے کبھی نہیں

اے جوشؔ سہے حقیقتِ دُنیا نگاہ میں
غم کا نہیں ہے غم تو خوشی کی خوشی نہیں

(۵۲)

ہر گام پر آفت ہے مصیبت ہے بلا ہے
ہستی مری نظروں میں گناہوں کی سزا ہے

اب ہم بھی کچھ اظہارِ تمنّا نہ کریں گے
وہ رُوٹھ گئے ہیں تو ہمارا بھی خدا ہے

ساقی مجھے دو گھونٹ پہ ٹالا ہے جو تو نے
دل بھی مرا توبہ کی طرح ٹوٹ گیا ہے

شمشیر بہ کف ہونے کی حاجت نہیں تم کو
وعدہ ہی تمہارا مجھے پیغامِ قضا ہے

مانوس وہ کیا ہوں مری فریاد و فغاں سے
ہر نالۂ غم سازِ شکستہ کی صدا ہے

دل ہے وہی جس میں ہو ترا سوزِ محبت
دُنیا کے لیے داغِ تمنّا ہے تو کیا ہے

اے مستِ رعونت یہ جوانی نہ رہے گی
جس حُسن پہ نازاں ہے وہ پرتول رہا ہے

کچھ جذبۂ صادق ہو کچھ اخلاص و ارادت
اس سے ہمیں کیا بحث وہ بُت ہے کہ خدا ہے

آغازِ وفا جوشؔ میں اب بھول چکا ہوں
اب دل مرا انجامِ وفا سوچ رہا ہے

(۵۳)

کس بلا کا حسن ہے اے روحِ گلشن پھول میں
خود تری تصویر کا ہے رنگ و روغن پھول میں

آنکھ ڈالی جس نے وہ مسحور ہو کر رہ گیا
چھپ کے بیٹھا ہے کوئی تو ساحرِ فن پھول میں

حسن ہو تو داد دیتے ہیں خود اہلِ حسن بھی
رنگِ گل کو ہم نے دیکھا گل بہ دامن پھول میں

اللہ اللہ یہ بہارِ حسن یہ رنگینیاں
پھول گلشن میں نظر آیا کہ گلشن پھول میں

اس جہانِ رنگ و بو میں دیوتا آباد ہیں
اپنا مندر تو بنا لے اے برہمن پھول میں

پھول کے دو چار ساغر اور اے ساقی لنڈھا
خوب تر کر دے مری توبہ کا دامن پھول میں

موت نے آخر مٹا دیں سب کے دل کی رنجشیں
دوست بن کر آ گیا ہر ایک دشمن پھول میں

یہ تری قسمت نے کانٹے بو دیئے اے عندلیب
بے طرح الجھا ہوا ہے تیرا دامن پھول میں

ان میں جو اچھا ہے چن لے اے نگاہِ انتخاب
ایک گلشن خار میں ہے ایک گلشن پھول میں

اے خزاں اب خار و خس میں بھی جگہ پاتا نہیں
آہ وہ طائر کہ تھا جس کا نشیمن پھول میں

اس غزل میں جوشؔ تم نے رنگِ معنی بھر دیا
کھینچ دی کیا دل ربا تصویرِ گلشن پھول میں

(۵۴)

بڑی تاثیر والے تیرے دیوانوں کے نالے ہیں
چمن والوں نے بھی اپنے گریباں پھاڑ ڈالے ہیں

کسے دیتا ہے راحت دورِ ہفت افلاک اے نادل
بھرا ہے زہرِ غم جن میں یہی تو وہ پیالے ہیں

فغاں میں برقِ سوزاں کا اثر پیدا کر اے بلبل — یہ آہیں کوئی آہیں ہیں یہ نالے کوئی نالے ہیں
حیاتِ جاوداں آئی ہے جاں بازوں کے حصّے میں — ہمیشہ جینے والے ہیں یہ جلنے مرنے والے ہیں
خدا کا خوف کر مشقِ جفا اتنی نہیں اچھی — ترے تیروں نے اے سفّاک سینے چھان ڈالے ہیں
ہراساں ہو نہ ہرگز رہزنوں سے راہِ الفت میں — جو اس رستے میں لٹ جائیں بڑی تقدیر والے ہیں
نوازش کی ہے اکثر اس نے رحمت کی سند ہو کر — ہزاروں کام ہم نے داغِ عصیاں سے نکالے ہیں
یہی ترکِ ہوس ہے تو ہوس کیا شے ہے اے زاہد — خیالِ حور میں سجدے بھی تو نے بیچ ڈالے ہیں
اُسی کی چاہ میں آفت آئے ہیں نہ مانوں گا — بہت گرتے ہوئے جس کی نگاہوں نے سنبھالے ہیں
لحاظِ ناتوانی سے یہی مقبول ہوں یارب — یہ چار اشکِ ندامت بھی مصیبت سے نکالے ہیں
گزر بادِ خزاں کا جن کے پھولوں پر نہیں ہوتا — ہمارے داغِ دل بھی جوش اسی گلشن کے لالے ہیں

(۵۵)

آہ و فغاں نہ اس قدر اے دلِ بے قرار کر — صبر بھی اختیار کر جبر بھی اختیار کر
نیند حرام جس نے کی موت کے انتظار میں — موت نے اس سے کہہ دیا حشر کا انتظار کر
جان جب ان کو سونپ دی ماو شما کہاں رہا — ان کی خطا بھی اے خدا میری خطا شمار کر
نالۂ ناتواں مرا کچھ تو اثر دکھا گیا — کان میں آئی یہ صدا کہیے ذرا پکار کر
ساغرِ مُل میں کچھ نہیں جلوۂ گل میں کچھ نہیں — وقت ملے تو دو گھڑی سیرِ دلِ فگار کر

تائبِ کبر و ناز ہو محوِ سرِ نیاز ہو　　حُسن کا اعتبار کیا عشق کا اعتبار کر
اے دلِ دردآشنا خط کا جواب سُن لیا　　اور تو بے قرار ہو اور تو انتظار کر
جوششِ بساطِ شوق میں مرگ ہے اصلِ زندگی　　بازیِ عشق جیت لے بازیِ عمر ہار کر

(۵۶)

سلامِ شوق پر کیوں دل کی حیرانی نہیں جاتی　　بڑے انجان ہو صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
سُبک دوشِ مصائبِ زندگی میں کون ہوتا ہے　　قضا جب تک نہیں آتی گراں جانی نہیں جاتی
نہیں ہوتا کسی سے چارۂ وحشت نہیں ہوتا　　نہیں جاتی ہماری چاک دامانی نہیں جاتی
ستم کو بھی کرم سمجھا جفا کو بھی وفا سمجھا　　مگر اس پر بھی اُن کی چینِ پیشانی نہیں جاتی
عجب خُو ہے کہ بے مطلب کی اکثر مان لیتے ہو　　مگر مطلب کی جب کہیے تو وہ مانی نہیں جاتی
مرض کا جاننا یا نبض کا پہچاننا کیسا　　ترے بیمار کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
تمھاری پُرغضب چتون مجھی پر وار کرتی ہے　　یہ برچھی غیر کے سینے پہ کیوں تانی نہیں جاتی
وہی رندی ہے جس کے ساتھ شانِ پارسائی ہو　　وہ مے کیا دامنِ تقویٰ میں جو چھانی نہیں جاتی
بہار آئی ہے یا سارے زمانے پر شباب آیا　　کسی سے زالِ دُنیا اب تو پہچانی نہیں جاتی
وہی تیور وہی گھاتیں وہی فتنے نگاہوں کے　　قیامت میں بھی اُن کی حشر سامانی نہیں جاتی
ترے کوچے میں رہ کر مجھ کو مرمٹنا گوارا ہے　　مگر دیر و حرم کی خاک اب چھانی نہیں جاتی

کیا ہے جوشؔ ترکِ مے کشی کا عہد گو میں نے — مگر اس عہد پر میری پشیمانی نہیں جاتی

(۵۷)

چھوڑ دو غصے کی باتیں اشتعال اچھا نہیں — اتنا رنج اتنا گلہ اتنا ملال اچھا نہیں

خستگی بھی شرط ہے اُن کی نوازش کے لئے — حال اچھا ہے اُسی کا جس کا حال اچھا نہیں

گردشِ تقدیر کا چکر وہی جاری رہا — کیا مرے طالع میں یارب کوئی سال اچھا نہیں

اب تمہاری چارہ سازی کا بھرم کھُلنے کو ہے — لوگ کہتے ہیں مریضِ غم کا حال اچھا نہیں

مر گئے جو راہِ اُلفت میں مسیحا ہو گئے — کون کہتا ہے محبت کا مآل اچھا نہیں

بدنصیبی بدنصیبی ہے مگر اتنی بھی کیا — کوئی دن کوئی مہینا کوئی سال اچھا نہیں

یادِ ایامِ جوانی اک مصیبت ہے مجھے — خواب اچھا تھا مگر اس کا خیال اچھا نہیں

جس نے فریاد و فغاں کو بارہا ٹھُکرا دیا — ہائے پھر کہنا پڑا اس سے کہ حال اچھا نہیں

عمرِ رفتہ پر کفِ افسوس کیوں ملتے ہو جوشؔ — جلنے والی چیز کا اتنا ملال اچھا نہیں

(۵۸)

نویدِ زندگی لے کر ہوائے مشکبار آئی — چمن والوں کو مژدہ ہو کہ پھر فصلِ بہار آئی

فغاں ہر دل سے اُٹھی لب پہ جانِ بے قرار آئی — قضا آئی قفس والوں کی یا فصلِ بہار آئی

چمن والوں کو یارب تُو نے یہ کس پھیر میں ڈالا — کبھی فصلِ خزاں آئی کبھی فصلِ بہار آئی

گل و شبنم کا عالم دیکھ کر حیران ہوتا ہوں / کہیں روتی کہیں ہنستی ہوئی فصلِ بہار آئی
عدم آباد میں تو کوئی مے خانہ نہیں ہوتا / جوانی کے نشے میں جھومتی فصلِ بہار آئی
خزاں کا خوف، بجلی کا خطر، صیاد کا کھٹکا / یہی فصلِ بہار آئی تو کیا فصلِ بہار آئی
نئے ارمان سب کے دل میں پیدا کر دیئے اس نے / شگوفے ہر قدم پر چھوڑتی فصلِ بہار آئی
ہوئے گل رنگ سب شاخ و شجر رنگِ مسرت سے / چمن والوں سے ہولی کھیلتی فصلِ بہار آئی
تسلی کا کوئی پہلو تو ہو افسردہ حالی میں / الٰہی کوئی جھوٹوں ہی کہے فصلِ بہار آئی
مٹایا میری بے رنگی نے جھگڑا رنج و راحت کا / نہ پھر فصلِ خزاں آئی نہ پھر فصلِ بہار آئی
کیا دہلی میں جلسہ شملے والی بزمِ اردو نے / فرازِ کوہ سے میدان میں فصلِ بہار آئی
دو رنگی انقلابِ دہر میں اے جوشؔ کیسی ہے / کبھی فصلِ خزاں آئی کبھی فصلِ بہار آئی

(۵۹)

ہوئے وہ مہرباں مجھ پر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں / یہی دم سازیاں دم پر بنا دینے کی گھاتیں ہیں
سیہ بختی نے کی ہے زندگی تاریک تر ایسی / ہمارے غم کدے میں دن نہیں راتیں ہی راتیں ہیں
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں ذکرِ اربابِ وفا سن کر / یہ کس عالم کا ہے مذکور کس دنیا کی باتیں ہیں
شکستِ انجام قیس و کوہ کن ہی کو نہیں دیکھا / بساطِ عشق و الفت پر تو ہر شاطر کو ماتیں ہیں
کہا تم نے سنا میں نے اب اور اتنا بتا جاؤ / یہ وعدے ہیں کہ فقرے ہیں یہ باتیں ہیں کہ گھاتیں ہیں

بہت اُکتا گیا جی کیا سُنوں رودادِ محشر کی / زمانے بھر کے قصّے ہیں زمانے بھر کی باتیں ہیں
حریمِ ناز کے پردوں کی گنتی ہو نہیں سکتی / زمیں سے عرشِ اعظم تک قناتیں ہی قناتیں ہیں
مری ہر بات کو ہر التجا کو رَد کیے جانا / ذرا انصاف سے کہیے یہ باتیں کوئی باتیں ہیں
مضامینِ محفلِ عیش و طرب کے جوشؔ کیا سُوجھیں / وہی میں ہوں وہی غم ہے وہی فرقت کی راتیں ہیں

(۶۰)

مہربانی اور بھی تڑپائے گی / اُن کے آنے پر بھی شامت آئے گی
موت ہی انسان کی دشمن نہیں / زندگی بھی جان لے کر جائے گی
چھوڑیئے تسکینِ خاطر چھوڑیئے / یہ تو مجھ کو اور بھی تڑپائے گی
بدگماں ہوں تجھ سے اے عمرِ رواں / سچ بتا مجھ کو کہاں لے جائے گی
موت سے غافل رہیں یا ہوشیار / آنے والی اک نہ اک دن آئے گی
آدمی تو کیا فرشتے کی نظر / آپ کی صورت سے دھوکا کھائے گی
جوشؔ ہم تم کو بہت سمجھا چکے / اب طبیعت ہی تمھیں سمجھائے گی

(۶۱)

ڈبو دی آبرو قسمت نے میری چشمِ گریاں کی / ملا دی خاک میں سب ترجمانی دردِ پنہاں کی
جنونِ عشق نے اتنا بڑھایا میری عظمت کو / قسم کھاتے ہیں دیوانے بھی اب میرے گریباں کی

نیاز و نیاز کی محفل نہ سوز و ساز کا عالم
بڑی بے کیف ہوگی زندگی جنت میں انساں کی

دعا سے ہاتھ اُٹھانے کے سوا میں اور کیا کرتا
درِ ایجاب نے تو ایک بھی مشکل نہ آساں کی

جہاں دیکھا حوادث کا یہ ٹھکرایا ہوا دیکھا
جو سچ پوچھو تو مٹی خوار ہے دُنیا میں انساں کی

عیادت کو وہ آئے بھی تو یہ کہتے ہوئے اُٹھے
پریشاں حال نے میری طبیعت بھی پریشاں کی

کسی کے کشتگانِ ناز کا یہ ناز تو دیکھو
چمن زاروں پہ ہنستی ہے بہار اُن کے گلستاں کی

امانت کا بھرم بھی کھو دیا بارِ امانت نے
الٰہی یہ شرف بخشا کہ شامت آئی انساں کی

کسی کی یاد میں دشتِ جنوں کی خاک اُڑاتا ہوں
یہی تعبیر ہے شاید مرے خوابِ پریشاں کی

نشاں تک بھی مٹا ڈالو شہیدانِ محبت کا
محبت داد دے گی تم کو اس کارِ نمایاں کی

سفینے کو ابھی اے جوش ساحل ہی پہ رہنے دو
خبر دیتی ہیں موجیں ایک حشر انگیز طوفاں کی

(۶۴)

سر کے ساتھ آشفتہ حالی جائے گی
یہ بلا مر کر ہی ٹالی جائے گی

کھائے جاتا ہے یہی مجھ کو خیال
کب تمھاری بے خیالی جائے گی

پرسشِ اعمال ہوتی ہے تو ہو
یہ مصیبت بھی اٹھالی جائے گی

خلد میں دل بستگی اپنی کہاں
اک الگ دُنیا بسالی جائے گی

ضعف سے ہم خود سنبھل سکتے نہیں
زندگی کیوں کر سنبھالی جائے گی

آپ ہی آئیں تو جائے دردِ ہجر
یہ بلا ہم سے نہ ٹالی جائے گی

ہے یہی اے جوشؔ اگر طوفانِ غم
جانِ مشکل سے سنبھالی جائے گی

(۶۳)

دیئے مجھے غم تو یا رب یہ عنایت اور ہو جاتی
مرے راحت طلب دل کی بھی فطرت اور ہو جاتی

نہ کی تکرار ہم نے ورنہ وقّت اور ہو جاتی
کدورت اور بڑھ جاتی عداوت اور ہو جاتی

بتا اے ضبطِ غم کیوں روک لیں خوں باریاں تو نے
بُرا کیا تھا اگر دامن کی زینت اور ہو جاتی

وفا آتی نہ تھی تم کو تو پہلے کہہ دیا ہوتا
ہمارے حال پر اتنی عنایت اور ہو جاتی

کہاں تک ہم انھیں آمادۂ پاسِ وفا کرتے
تقاضا اور ہوتا کوئی حُجّت اور ہو جاتی

جنوں نے کی یہ دانائی کہ لے آیا بیاباں میں
گلستاں میں تو میرے دل کو وحشت اور ہو جاتی

کمی کیوں آپ نے پینے میں کی اے حضرتِ واعظ
یہی ہوتا کہ تھوڑی سی ندامت اور ہو جاتی

مصوّر دستِ رنگیں ہیں نمکداں بھی بنا دیتا
تمھارے حُسن میں پیدا ملاحت اور ہو جاتی

بنایا تھا اگر دل کو تو ذوقِ صبر بھی دیتا
الٰہی صرف اس پر اتنی حکمت اور ہو جاتی

ابھی کچھ تشنگی اے جوشؔ ہے ذوقِ سماعت کو
کرم ہوتا غزل کوئی جو حضرت اور ہو جاتی

(۶۴)

قضا ہی نہیں امتحاں اور بھی ہیں
مری راہ میں ہفت خواں اور بھی ہیں

بجز اشکِ غم کے نشاں اور بھی ہیں
مرے درد کے ترجماں اور بھی ہیں

مہ و مہر و انجم کو دیکھا تو جانا
کہ بھٹکے ہوئے کارواں اور بھی ہیں

ابھی اپنی محشر خرامی نہ چھوڑو
سرِ راہ کچھ نیم جاں اور بھی ہیں

حرم سے کچھ آگے بڑھے ہم تو دیکھا
جبیں کے لئے آستاں اور بھی ہیں

بنادی مرے دم پہ ایک آسماں نے
غضب ہے کہ چھ آسماں اور بھی ہیں

انھیں بھی تو دامن سے دھو ڈالئے گا
مرے خوں کے کچھ نشاں اور بھی ہیں

تمھاری جفا کا گلہ کرنے والے
بہت سے مرے ہم زباں اور بھی ہیں

ہمارا ہی دل مضطرب کیوں ہے اتنا
چمن میں قفس آشیاں اور بھی ہیں

کفایت کا الزام ساقی پہ کیسا
مریدانِ پیرِ مغاں اور بھی ہیں

کہاں تک سُنے جائیں اے جوش تم کو
یہاں چند معجز بیاں اور بھی ہیں

(۶۵)

اب کس سے پوچھیں تو نے بنایا ہے گھر کہاں
دَیر و حرم بھی دیکھ لئے تو مگر کہاں

سب پوچھتے ہیں بیٹھ رہا نامہ بر کہاں
اپنی خبر نہیں تو کسی کی خبر کہاں

ادراک کی حدوں سے بھی آگے نکل گیا
لے جائے دیکھئے مرا ذوقِ نظر کہاں

اُن کی اَدا سے دل کو بچائے گا کیا کوئی
اس تیرِ بے پناہ کی زد سے مفر کہاں

صیاد کس لئے ہے قفس کی تلاش میں
اب جا سکے گا طائرِ بے بال و پر کہاں

نادان ہیں وہ جن کو تمنا ہے دید کی
اتنی کسی کی آنکھ میں تابِ نظر کہاں

داغِ محن اُٹھا کہ تمنا ہو بارور
جب پھول ہی نہیں تو شجر میں ثمر کہاں

بے تابیوں کو دیکھ کے حیران کیوں ہیں آپ
صبر و سکوں کہاں دلِ شوریدہ سر کہاں

ہر ذرہ آستاں ہے تری جلوہ گاہ کا
تو ہی بتا مجھے کہ جھکاؤں میں سر کہاں

اپنی نظر میں بھی انھیں ملتی نہیں جگہ
اہلِ ہنر بنائیں گے دُنیا میں گھر کہاں

شہرہ تمھارے زہد کا ہے شہر بھر میں جوش
پیتے بھی تم نہیں ہو مگر آج ادھر کہاں

(۹۶)

کیا قہر تھی کسی کی ادا کچھ نہ پوچھئے
کیا کر گیا یہ تیرِ قضا کچھ نہ پوچھئے

اِس بے رُخی سے حال مرا کچھ نہ پوچھئے
یا سنئے غور سے اسے یا کچھ نہ پوچھئے

گھر سے بھی اقربا نے نکالا پسِ وفات
کیا حشر زندگی کا ہوا کچھ نہ پوچھئے

یہ تو خبر ہے کب ہوئی نازل بلائے عشق
کیوں کر ہوا نزولِ بلا کچھ نہ پوچھئے

کہتا ہے خضر بھی کہ ہے راہِ طلب یہی
منزل کہاں ہے اس کا پتا کچھ نہ پوچھئے

میں نے کہا تو یہ تھا کہ تقصیر ہو معاف
اس کے جواب میں جو سُنا کچھ نہ پوچھئے

دو چار دن تو مجھ کو رہی تابِ صبر و ضبط
جو حال اس کے بعد ہوا کچھ نہ پوچھئے

اب وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ بے قصور تھا
مظلومیٔ شہیدِ وفا کچھ نہ پوچھئے

کچھ تلخ تو ضرور ہے یہ لے جنابِ شیخ
پینے کے بعد اس کا مزا کچھ نہ پوچھئے

اک دشمنِ وفا سے ہے چشمِ وفا انہیں
دیوانگیٔ اہلِ وفا کچھ نہ پوچھئے

شرطِ وفا یہ ہے کہ گوارا ہو جوَر بھی
وہ نارَوا ہے یا ہے رَوا کچھ نہ پوچھئے

میں بندۂ رضا ہوں کہوں بھی تو کیا کہوں
مجھ سے مری خطا کی سزا کچھ نہ پوچھئے

قائل خدا کا یوں تو ہے سارا زمانہ جوشؔ
کتنا ہے احترامِ خدا کچھ نہ پوچھئے

(٦٧)

پُوچھا نہ کبھی تم نے کہ تجھ کو یہ ہوا کیا
اتنا بھی نہ ہو جب تو محبّت کا مزا کیا

ناکردہ گناہی میں گرفتار ہوا ہوں
اب دیکھئے اس جرم کی ملتی ہے سزا کیا

محفل سے نکالو ہمیں کچھ سوچ سمجھ کر
جب ہم نہ رہے آپ کی محفل میں رہا کیا

پروا نہیں کچھ تم کو تو پروا نہیں اس کی
مجبورِ محبّت کو تغافل کا گِلا کیا

یہ حرفِ "تسلی" بھی ستم سے نہیں خالی
کہتے ہیں ستم کوئی ہوا بھی تو ہوا کیا

اک داغ کلیجے میں تو اک داغ ہے دل میں
انعامِ محبّت کا ملا بھی تو ملا کیا

خود وار کئے تیغِ ادا کے مرے دل پر
اب پُوچھ رہے ہو یہ ہوا کیا یہ ہوا کیا

دُنیا سے محبت ہے نہ عقبیٰ سے کچھ اُلفت
معلوم نہیں ہم کو سزا کیا ہے جزا کیا

مطلع نظر آتا ہے مکدر مجھے اے جوشؔ
بگڑے گی ابھی اور زمانے کی ہوا اور

(۶۸)

عرفانِ حقیقت سے مجھ کو یہ ہنر آیا
بگڑا ہوا نقشہ بھی بے عیب نظر آیا

گلشن میں بہار آئی کیا جوشِ نمو لے کر
ہر زخم ہوا تازہ ہر داغ اُبھر آیا

اب اپنی جفاؤں پر کچھ کچھ وہ پشیماں ہیں
صد شکر کہ آہوں میں اتنا تو اثر آیا

کیا جلوہ نمائی ہے کیا پردہ نشینی ہے
آنکھوں میں سماتے ہی وہ دل میں اُتر آیا

خالی نہ رہا صحرا شوریدۂ اُلفت سے
اک خاک بسر نکلا اک خاک بسر آیا

دُنیا سے ملی رخصت ہر غم سے ہوئی فرصت
پیغامِ سکوں لے کر پیغامِ سفر آیا

ہنستوں پہ یہ روتا ہے روتوں پہ یہ ہنستا ہے
ہر طور زمانے کا بے طور نظر آیا

حیراں ہیں چمن والے اس شوقِ اسیری پر
میں نغمہ سرا ہو کر صیاد کے گھر آیا

رنگِ مئے گلگوں تو سرمایۂ فرحت ہے
واعظ تری آنکھوں میں کیوں خون اُتر آیا

جس تیر سے پانی ہو پتھر کا کلیجا بھی
دل اس کے نشانے پر بے خوف و خطر آیا

اے جوشؔ جو آنکلا مے خانۂ دُنیا میں
اک جامِ ہوس پی کر بے ہوش نظر آیا

(۶۹)

خواب سمجھو خیال راحت کا
زندگی نام ہے مصیبت کا

آہ و فریاد ۔ نالہ و شیون
یہی انعام ہے محبت کا

اُنس ہم کو نہیں گناہوں سے
امتحاں کر رہے ہیں رحمت کا

خود نمائی تو اُس کی ہے فطرت
حسن بھوکا نہیں ہے شہرت کا

آدمی ہیں شمار سے باہر
قحط ہے پھر بھی آدمیت کا

راہ ناپید رہ نما ناپید
سامنا ہے عجب مصیبت کا

بارِ اُلفت وہ کیا اُٹھائیں گے
عذر ہے اس میں بھی نزاکت کا

یہی برتاؤ ہے تو جاتا ہوں
شکریہ آپ کی عنایت کا

نقص تو جذبِ دل میں ہے لیکن
نام بدنام ہے محبت کا

روح اس شعر میں کہاں سے اے جوش
جس میں جوہر نہ ہو فصاحت کا

(۷۰)

جو ستم اس نے کیے سب کو بھلانا ہی پڑا
بارِ عصیاں کی طرح ناز اُٹھانا ہی پڑا

پرسشِ حال پہ حال اپنا سنانا ہی پڑا
ایک ہنستی ہوئی صورت کو رلانا ہی پڑا

اپنی وارفتگیِ غم کو چھپانا ہی پڑا
آ گئے وہ تو مجھے آپ میں آنا ہی پڑا

اپنی قسمت سے بغاوت تو بہت کی میں نے
لیکن آخر سرِ تسلیم جھکانا ہی پڑا

غم و اندوہ کی باتوں سے خفا ہوتے ہیں وہ
کیا کروں گا میں اگر حال سنانا ہی پڑا

لن ترانی کی صدا آئی ہے اے غیرتِ عشق — اپنا اعجاز تجھے اب تو دکھانا ہی پڑا

سن لیا تھا وہ عیادت کے لئے آئیں گے — ملک الموت کو باتوں میں لگانا ہی پڑا

نگہِ گرم سے وہ گرم ہوئے جاتے ہیں — دل کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو دبانا ہی پڑا

کر دیا دردِ جدائی نے دعا پر مجبور — ہاتھ خود داریِ الفت سے اٹھانا ہی پڑا

دردمندوں کو بھی جو حال سنایا نہ کبھی — تجھ سے بے درد کو آخر وہ سنانا ہی پڑا

ضبط کی داد نہ دی کاوشِ غم نے اے جوشؔ — دل سے لب تک مری فریاد کو آنا ہی پڑا

(۷۱)

گراں پائی سے کھلتا ہے تو کھل جائے بھرم میرا — معاذ اللہ اے شوقِ منزل اب نہیں اٹھتا قدم میرا

زمانے بھر میں اور اس کا ٹھکانا بھی نہیں کوئی — کہاں جائے مرے دل سے نکل کر رنج و غم میرا

کسی کی تیغِ جوہر دار کس دعوے سے کہتی ہے — غنیمت ہے گنہگارانِ آزادی میں دم میرا

وہ مجبورِ محبت ہوں وہ معذورِ شکایت ہوں — جفا و جور پر بھی ہے سرِ تسلیم خم میرا

مٹانے کی ہوس تجھ کو بھی اے ظالم مٹائے گی — تری ہستی کو بھی برباد کر دے گا عدم میرا

کہاں اتنی فلک پیری کہاں اتنی زمیں گیری — مری افتادہ پر حیران ہے نقشِ قدم میرا

سکت باقی نہیں اس میں بھی شرحِ ناتوانی کی — مرے دم کی طرح رکتا ہے کاغذ پر قلم میرا

خزاں میں کاش دل کے داغ بھی افسردہ ہو جائیں — انھیں پھولوں کی بو سے ناک میں آیا ہے دم میرا

گلہ بے گانگی کا میں کروں اے جوشؔ کس منہ سے
ہر اک غم خوار کو بے زار کر دیتا ہے غم میرا

(۷۲)

تری یاد میں کب قیامت نہ ٹوٹی ترے غم میں کب حشر برپا نہ دیکھا
بجز اک نگاہِ مسیحا نفس کے محبت کے ماروں نے کیا کیا نہ دیکھا

بہت سیر کی باغِ جنت کی ہم نے مگر کچھ مزا زندگی کا نہ دیکھا
کسی دل میں دردِ محبت نہ پایا کسی دل میں داغِ تمنا نہ دیکھا

بہت مردِ میداں بھی دنیا میں دیکھے شجاعت پہ نازاں بھی دنیا میں دیکھے
مگر چوٹ سہ جائے تیرِ نظر کی یہ دل یہ کلیجا کسی کا نہ دیکھا

یہی ہے نظارا تو کیا ہے نظارا نہ شانِ جمالی نہ شانِ جلالی
یہ دھندلا سا پرتو بہ دستور جلوہ برابر ہے ہم کو تو دیکھا نہ دیکھا

جنونِ محبت میں دیوانگی میں تری بے رخی کا بھی ہیں قدرداں ہو
بڑا تو نے احسان مجھ پر کیا یہ تماشا بنا کر تماشا نہ دیکھا

ترے آستاں کا پتا کس سے پائیں کرے رہبری کون بھٹکے ہوؤں کی
یہ راہِ طلب ہے کہ راہِ عدم ہے کسی کا بھی نقشِ کفِ پا نہ دیکھا

محبت کہاں یہ تو بے چارگی ہے ستم بھی سہیں پھر کرم اس کو سمجھیں

بہ جبر اس لئے کرلیا ہے گوارا کہ اس کے سوا کوئی چارا نہ دیکھا

نیازِ محبت سے یہ بے نیازی خلوصِ محبت سے اتنا تغافل
مرا درد تم نے مرا حال تم نے نہ جانا نہ سمجھا نہ پوچھا نہ دیکھا

تمھیں جوشؔ ہم خوب پہچانتے ہیں تمھاری بلا نوشیاں جانتے ہیں
کہاں تم کہاں پارسائی کا جامہ کبھی ہم نے ایسا دکھاوا نہ دیکھا

(۷۳)

پھر ہوا باغِ جہاں میں جمع سامانِ بہار
پھر در و دیوار سے پیدا ہوئی شانِ بہار

قدر دانی اس قدر کی دیکھ کر شانِ بہار
موتیوں سے بھر دیا شبنم نے دامانِ بہار

ہر کلی ہر پھول کو دعویٰ ہے اپنے حسن پر
دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار

ہے یہی جوشِ نموئے گل اگر اے باغباں
شاخِ گل پر بار ہو جائے گا احسانِ بہار

پڑھنے والوں کی نگاہیں گل بداماں ہو گئیں
کیا خطِ گلزار میں لکھا تھا فرمانِ بہار

روئے گل کی آب ہے یارب کہ اک دریائے حسن
بوئے گل کی موج ہے یارب کہ طوفانِ بہار

خواب آلودہ اگر ہے آنکھ نرگس کی تو ہو
طالعِ بیدار خود ہوگا نگہبانِ بہار

حسن کو نسبت ہے کچھ سودائے الفت سے ضرور
ہم نے اکثر چاک دیکھا ہے گریبانِ بہار

جی نہیں بھرتا مرا اے جوشؔ سیرِ باغ سے
جس کلی کو دیکھتا ہوں ہے وہی جانِ بہار

(۷۴)

اک نہ اک کانٹا الم کا عمر بھر دل میں رہا
مشکلیں حل کرنے والا سخت مشکل میں رہا

صحبتِ ماضی رہی ہر دم مرے پیشِ نظر
اُن کی محفل سے نکل کر اُن کی محفل میں رہا

تیری رحمت جس کا لنگر بن گئی طوفان میں
وہ سفینہ ہر جگہ آغوشِ ساحل میں رہا

کیا کہوں شانِ جلالی رُوئے پُر تنویر کی
شمع کا شعلہ بھی لرزاں اُن کی محفل میں رہا

پاس تھا اُن کو مرے ذوقِ خلش کا اس قدر
تیر بھی دل میں رہا ارمان بھی دل میں رہا

آئے بھی روتے ہوئے نکلے بھی سب روتے ہوئے
ہر گھڑی ماتم بپا دُنیا کی محفل میں رہا

ہم نے وحشت میں بھی اس کی یاد سے غفلت نہ کی
چھان ڈالے دشت لیکن پاؤں منزل میں رہا

اک مرا ارمان جس کی بے کسی کو روئیے
اک ترا وعدہ جو اب تک مدِّ فاصل میں رہا

پوچھتے ہیں جوشؔ وہ سُن کر مری رُودادِ غم
کس پہ یہ مشکل بنی تھی کون مشکل میں رہا

(۷۵)

چمن میں رخصتِ گل کو دیکھتا ہوں چشمِ حیراں سے
مرے دامن کے پُرزے کون اُٹھا لایا بیاباں سے

شکستِ پائے ہمّت پر جنونِ گرم رفتاری
کسی کے نقشِ پا نے مجھ کو دیکھا چشمِ حیراں سے

طبیعت کی لطافت کا نہیں ہے قدرداں کوئی
پریشاں حال ہو کر بوئے گل نکلی گلستاں سے

ہلاکت سے بھی ہے اے خضر طولِ زندگی بدتر
مجھے معذور رکھ میں باز آیا آبِ حیواں سے

کمالِ ناخدائی کچھ دکھا لے ناخدا مجھ کو — سفینہ کھیلتا جائے تلاطم خیز طوفاں سے
مری جمعیتِ خاطر کا ساماں کیا کرے کوئی — زمانہ خود پریشاں ہے مرے حالِ پریشاں سے
اسیرانِ محبّت پر کچھ ایسا سخت پہرا ہے — نکل سکتے نہیں زنجیر کے نالے بھی زنداں سے
بہت حیراں ہوں دنیا میں اتنی شورشیں کیوں ہیں — اسے نزدیک کی نسبت ہے جب شہرِ خموشاں سے
جنابِ داغ نے اے جوشؔ مجھ پر وہ عنایت کی — عقیدت کی نظر بھی جھک گئی ہے بارِ احساں سے

(۷۶)

جب دعائیں بھی کچھ اثر نہ کریں — کیا کریں صبر ہم اگر نہ کریں
داستاں ختم ہو ہی جائے گی — آپ قصّہ تو مختصر نہ کریں
چھوڑتا ہی نہیں ہمیں صیّاد — ورنہ پر ولئے بال و پر نہ کریں
وعدہ تو کر گئے ہیں وہ لیکن — خوف ہے پھر اگر مگر نہ کریں
اُس کی بے چارگی کا کیا کہنا — جس کی آہیں بھی کچھ اثر نہ کریں
ہُو کا عالم حرم میں ہے اے شیخ — ہم تو دو دن یہاں بسر نہ کریں
اُن کو احساسِ دردِ دل کیسا — مر بھی جاؤں تو آنکھ تر نہ کریں
قابلِ عفو ہیں نہیں نہ سہی — نہ کریں آپ درگزر نہ کریں
یا رہیں اس میں اپنے گھر کی طرح — یا مرے دل میں آپ گھر نہ کریں

وہ عنایت اگر نہیں کرتے — ظلم بھی مجھ غریب پر نہ کریں
رند بن کر پئیں مگر اے جوشؔ — اپنا دامن تو آپ تر نہ کریں

(۷۷)

وہ اشفاق و لطفِ خاص کس پر روا نہیں ہوتا — مجھی پر وہ کرم فرما کرم فرما نہیں ہوتا
وہ آئے ہیں تو اے دل چھوڑ شکوے دردِ فرقت کے — خوشی میں رنج و غم کا تذکرہ اچھا نہیں ہوتا
تمہاری تیغ کس دن قتل کی دھمکی نہیں دیتی — تمہارا تیر کس دن خون کا پیاسا نہیں ہوتا
تمہیں کیا حشر کے فتنوں کا ڈر تم وہ قیامت ہو — کوئی فتنہ تمہارے سامنے برپا نہیں ہوتا
تمہاری مہربانی میں بھی تجدیدِ جفا دیکھی — ستم ہوتا ہے دنیا میں مگر اتنا نہیں ہوتا
لباسِ زہد پر رنگِ عقیدت کا یہ احساں ہے — بہت سی خاک اڑنے پر بھی وہ میلا نہیں ہوتا
ملامت سے جفا سے شان اس کی کم نہیں ہوتی — کسی صورت کمالِ عاشقی رسوا نہیں ہوتا
کرم آمادہ ہو جاتا ہے جور آمادہ گردوں بھی — مگر تو مہرباں جب تک نہیں ہوتا نہیں ہوتا
اسی وعدے پہ ہم جیتے ہیں جو تم بھول بیٹھے ہو — اسی وعدے پہ ہم مرتے ہیں جو ایفا نہیں ہوتا
وہاں بھی جوشؔ اس کا حسن سو پردوں میں رہتا ہے — جہاں کوئی بھی اس کا دیکھنے والا نہیں ہوتا

(۷۸)

نہ کی بات کوئی مدارات کی — شکایت رہی ہم کو ہر بات کی

قیامت بھی کم بخت آتی نہیں — کوئی تو ہو صورت ملاقات کی
اب اتنے پریشان ہوتے ہو کیوں — تمہیں نے تو پہلے شروعات کی
تری رحمتیں ہیں کفیلِ نجات — ہمیں کیا ضرورت مناجات کی
وہی بن گئی داستانِ جنوں — نگاہوں نے آپس میں جو بات کی
محبّت کی نیرنگیوں نے ہمیں — دکھائی ہے دُنیا طلسمات کی
وہ کہتے ہیں سُن کر شبِ غم کا حال — کہ پُوچھی تو دن کی کہی رات کی
تغافل شعاری پہ بھی غور کر — شکایت اگر ہے شکایات کی
مری پیاس کوئی بجھاتا نہیں — دہائی ہے پیرِ خرابات کی
تسلّی ہو کیا اُن کے نامے سے جوشؔ — ملے بھی تو آدھی ملاقات کی

(۷۹)

مرے دل کو اُس کی تلاش ہے جسے وہم بھی نہ دکھا سکے
اُسی بے نشاں کا خیال ہے جو خیال میں بھی نہ آ سکے
یہی التجا ہے کہ اے خدا مجھے حشر سے تو معاف رکھ
وہ ترے حضور میں آئے کیا جو کسی کو منہ نہ دکھا سکے
یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی
اُسے شوقِ دید عطا کیا جو نگہ کی تاب نہ لا سکے

مری حسرتوں کو گلہ یہ ہے کہ عدم سے کم نہیں دل ترا
کوئی اِس میں آ کے نہ جا سکے کوئی اُس میں آ کے نہ جا سکے

کہوں کیا میں حالِ مریضِ غم کہ ستم ظریفیِ حسن نے
وہ دیا ہے دردِ نہاں اُسے نہ دکھا سکے نہ چھپا سکے

یہ عجب دورنگیِ حسن ہے یہ عجب دورنگیِ عشق ہے
مرے گھر کبھی وہ نہ آ سکے مری یاد سے جو نہ جا سکے

کہے کون اُن سے یہ دردِ دل کہ ادب سے ہم ہیں دم بخود
نہ بتا سکے نہ جتا سکے نہ دکھا سکے نہ سُنا سکے

کسی دل کی بگڑی بنائے کیا کسی دل سے دل وہ لگائے کیا
کوئی بات ہو تو بنا سکے کوئی تیر ہو تو لگا سکے

یہ فغاں تو جوش ہے ناتواں اسے چھوڑ اس میں اثر کہاں
ترے سر میں چاہیئے وہ جنوں جو کسی کے ہوش اُڑا سکے

(۸۰)

وہی نالہ ہے جو دل سے اثر میں ڈوب کر نکلے　　وہی فریاد ہے جو دردو غم کی چارہ گر نکلے

متاعِ رنگ و بُو سے تھی بہت دل بستگی جن کو — بالآخر گلشنِ دُنیا سے دامن جھاڑ کر نکلے
وفا کی داد بھی مشقِ جفا کا اک بہانہ تھی — ترے الطاف بھی بے داد اے بے داد گر نکلے
بجز موسیٰ نہ تھا کیا لائقِ لطف و کرم کوئی — یہ کیا باعث دوبارہ تم نہ بامِ طور پر نکلے
مذاقِ بادہ نوشی کب ہوا محدود اے ساقی — نئے مے کش بھی آ پہنچے نئے ساغر اگر نکلے
نہ نکلے وہ شہادت گاہ سے جب تک نہ دم نکلا — ترے جاں باز میدانِ محبّت مار کر نکلے
ستم کش اک نہ اک صورت میں یوں تو ہر بشر ہوگا — بڑا مظلوم وہ ہے جس کے نالے بے اثر نکلے
جنابِ جوشؔ جو مشہور تھے اہلِ بصیرت میں — بڑے آشفتہ دل نکلے بڑے آشفتہ سر نکلے

(۸۱)

یہ نہ سمجھو آہ دل کی کارگر ہوتی نہیں — رائیگاں جاتی نہیں وہ بے اثر ہوتی نہیں
کیوں کبھی عصیاں پہ اے غافل نظر ہوتی نہیں — دامنِ تر کی طرح کیوں آنکھ تر ہوتی نہیں
ڈوبنے سے کیا ملا یہ ڈوبنے والوں سے پُوچھ — تیرنے والوں کو تہ کی کچھ خبر ہوتی نہیں
داستانِ دل بھی طولِ شامِ فرقت ہو گئی — مختصر کرتا ہوں لیکن مختصر ہوتی نہیں
عشق کی بے تابیاں ہی بانیِ بے داد ہیں — حُسن کی فطرت کبھی بے داد گر ہوتی نہیں
یاس میں دن بھی مرے تاریک راتیں بن گئے — صبح ہونے کو تو ہوتی ہے مگر ہوتی نہیں
وہ سکونِ قلب بخشا ہے تمنائے تیر نے — اب مری دُنیائے دل زیر و زبر ہوتی نہیں

پہلے بیگانوں کے غم میں بھی گھُلے جاتے تھے لوگ
اب یگانوں کے لئے بھی آنکھ تر ہوتی نہیں

کیا کہوں کیوں کر کہوں برباد کس نے کر دیا
مجھ سے ظاہر یہ ضمیرِ مستتر ہوتی نہیں

جوشؔ سب پر ہوتی ہے اُن کی عنایت کی نظر
اک نہیں ہوتی تو میرے حال پر ہوتی نہیں

(۸۲)

نادانی سے شیخ و برہمن خود کو رُسوا کرتے ہیں
ایک ہی منزل کے یہ مسافر ناحق جھگڑا کرتے ہیں

ہر نا اہل کے قدموں پر ہم جُھک کر سجدا کرتے ہیں
اک کم بخت ہوس کی خاطر جو نہ کیا تھا کرتے ہیں

کیا نادانی ہے کہ اُسی کو جانِ تمنّا کہتا ہوں
جس کی جفا کے تیر ہمیشہ خونِ تمنّا کرتے ہیں

اشکوں کو اے ضبطِ محبّت روک اگر تُو روک سکے
ورنہ سمجھ لے گھر کے بھیدی لنکا ڈھایا کرتے ہیں

اپنے بچّوں کو یہ ناگن مار کے خود کھا جاتی ہے
کس اُمّید پہ دُنیا والے دُنیا دُنیا کرتے ہیں

فہم سے باہر ہے یہ معمّا جوشؔ تمھیں کچھ غور کرو
دل میں جب وہ رہتے ہیں کیوں آنکھ سے پردا کرتے ہیں

(۸۳)

طلسمِ آب و گِل سے دل کو دھوکا ہو نہیں سکتا
ہمارا خوابِ ہستی خوابِ دُنیا ہو نہیں سکتا

ترا دل ہے وہ دل جس پر بھروسا ہو نہیں سکتا
زمانے کی طرح یہ بھی کسی کا ہو نہیں سکتا

اسی کو دیکھ کر اک دن وہ مجھ پر مہرباں ہو گئے
بُرا کیا ہے اگر زخمِ دل اچھا ہو نہیں سکتا

نہیں ہے تاب عالم کو بیانِ سوزِ پنہاں کی
ہمارے عشق کا دُنیا میں چرچا ہو نہیں سکتا

اگر طرزِ تغافل کی یہی ہے حشر انگیزی
قیامت تک ترا بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

غرض کیا تیرے دیوانے کو سیرِ بزمِ دُنیا سے
تماشا تو کبھی محوِ تماشا ہو نہیں سکتا

خدا کے واسطے اے ناخدا طوفان میں لے چل
مجھے ساحل نشیں ہونا گوارا ہو نہیں سکتا

تمھارا شوقِ پامالی ہی لے جوشِ اک قیامت ہے
خرامِ ناز سے تو حشر برپا ہو نہیں سکتا

(۸۴)

ساقی ترا کس پر کرمِ عام نہیں ہے
اک پھول بھی گلشن میں تہی جام نہیں ہے

رُسوائے محبت تو ہے تعظیم کے قابل
بدنام اُسے کہیے جو بدنام نہیں ہے

اس بزم کی بے کیفیِ صحبت کوئی دیکھے
جس بزم میں کچھ ذکرِ مے و جام نہیں ہے

معصومیِ اُلفت نے کیا پاس انھیں کا
کہتی ہے کہ اُن پر کوئی الزام نہیں ہے

رہ جائے نہ پیاسا کوئی اے خنجرِ قاتل
وہ فیض بھی اک تُجل ہے جو عام نہیں ہے

حد ہو گئی جب جور و ستم کی تو خطر کیا
انجام کو اندیشۂ انجام نہیں ہے

بے مہری و بے داد تو بے مہری و بے داد
وہ قتل یہ بھی قابلِ الزام نہیں ہے

ہے شورشِ دُنیا بھی یہ ہنگامۂ دیں بھی
اک خون کے قطرے کا تو دل نام نہیں ہے

کیا چارہ کروں میں دلِ بے تاب کا اے جوشؔ
اس کو تو کسی حال میں آرام نہیں ہے

(۸۵)

مجھ سے میرے شوقِ اُلفت کا گلہ ہونے لگا
آج کیا کرنے لگے تم آج کیا ہونے لگا

ترکِ اُلفت کی ندامت مجھ کو تڑپانے لگی
مدعی میرا دلِ بے مدعا ہونے لگا

مضطرب ہو کر انھیں کچھ اور بے زاری ہوئی
میں تو یہ سمجھا تھا اب نالہ رسا ہونے لگا

پرسشِ اعمال یا رب کیا اسی کا نام ہے
خفتگانِ خاک پر محشر بپا ہونے لگا

دل بری اے دل جسے نا آشنا رہ کر ملے
کیوں وہ بے مطلب کسی کا آشنا ہونے لگا

رحم کر اے انتہائے جوشِ سودا رحم کر
چاک دامن کا بھی اب دستِ دعا ہونے لگا

تو نے کیا وعدے کئے تھے اے امیدِ زندگی
ڈوبتی نبضوں کو دیکھ آ کر یہ کیا ہونے لگا

یہ طبیعت ہے تو باز آیا میں اس تقریب سے
بات بھی مُنہ سے نہیں نکلی گلا ہونے لگا

جوشؔ کیوں وہ زور کیوں وہ شور نالوں میں نہیں
کیا تمھارا سازِ غم بھی بے صدا ہونے لگا

(۸۶)

ادا میں حسن میں جانِ جہاں معلوم ہوتی ہے
ابھی تک زالِ دُنیا نوجواں معلوم ہوتی ہے

نظر کے سامنے ہے یوں ترے جلووں کی رنگینی
خزاں بھی اب بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

گلہ اُن کی جفاؤں کا کسی سے ہو نہیں سکتا
خدائی کی خدائی بے زباں معلوم ہوتی ہے

کرم اے سوزِ پنہانی کہ یہ الزام بھی آیا
تمھاری بے زبانی اب زباں معلوم ہوتی ہے

کسی کے بارِ اُلفت کا اُٹھانا اس سے بہتر تھا
سُبک ساری مجھے کوہِ گراں معلوم ہوتی ہے

مذاقِ اہلِ گلشن جس کو سمجھا نغمہ پیرائی
مجھے تو صاف تمہیدِ فغاں معلوم ہوتی ہے

مجھے مضمونِ خط پر اعتبار اصلا نہیں آتا
بظاہر تو اُنھیں کی یہ زباں معلوم ہوتی ہے

وہی رم آشنا تیور وہی مشکوک سی نظریں
تری تصویر بھی کچھ بدگماں معلوم ہوتی ہے

تری تاریکیاں اے گور کیا شمعِ ہدایت ہیں
حقیقت زندگانی کی یہاں معلوم ہوتی ہے

دکھائی شان تم نے جوشؔ کیا کیا اوجِ معنی کی
زمینِ شعر بھی اب آسماں معلوم ہوتی ہے

(۸۷)

اے محبت سچ بتا تجھ میں یہ کیا اعجاز ہے
تو سراپا سوز ہو کر بھی سراپا ناز ہے

یا چھلاوا یا پری یا سحر یا اعجاز ہے
یا فریبِ حسن یا اُن کی نگاہِ ناز ہے

کھُل گئی دل کی گرہ لیکن نہ یہ عقدہ کھُلا
میں ترا اک راز ہوں یا تو مرا اک راز ہے

آپ نے بھی آج خوئے بے نیازی چھوڑ دی
آج مجھ کو بھی نیازِ زندگی پر ناز ہے

کام یابِ جستجو ہوں لیکن اس کو کیا کروں
سامنے آ کر بھی وہ جلوہ سراپا راز ہے

کیا کہوں مجھ کو تصوّر نے کہاں پہنچا دیا
آسماں میری نظر میں فرشِ پا انداز ہے

عشق کا آغاز بھی حسرت کشِ انجام تھا
عشق کا انجام بھی حسرت کشِ آغاز ہے

یا تو آندھی ہے قفس کو جو اُڑا کر لے چلی
یا کسی بے بال و پر کی حسرتِ پرواز ہے

بندہ پرور کچھ تو کہیے عرضِ مطلب کا جواب
میرے ارمانوں کی دنیا گوش بر آواز ہے

آپ کے ہر شعر میں میرا بیانِ غم ہے جوشؔ
میری ہی آواز گویا آپ کی آواز ہے

(۸۸)

کامیابی کا اثر بھی ہو مری تدبیر میں
یہ نہیں تقدیر میں تو کچھ نہیں تقدیر میں

کہنے والا کیا کہے کیوں کر کہے کب تک کہے
آ نہیں سکتیں مری خاموشیاں تقریر میں

دل ربائی بھی وہی ہے کج ادائی بھی وہی
آپ ہی کا رنگ دیکھا آپ کی تصویر میں

شکوہ جن کوتاہیوں کا ہے مجھے اے چارہ گر
یا تری تدبیر میں ہیں یا مری تقدیر میں

کب مجھے فکرِ دلِ برباد سے فرصت ملی
عمر گزری ہے خراب آباد کی تعمیر میں

راز جو تخلیقِ انساں میں ہے کچھ کھلتا نہیں
رنگِ خاموشی بھی ہے اس بولتی تصویر میں

شورِ محشر سے بھی کشتے ہوش میں آتے نہیں
کس قیامت کے ہیں جوہر آپ کی شمشیر میں

پھونک دے گی اے فغاں آتش بداماں تجھے
یہ لگی دل کی بجھا لے ڈوب کر تاثیر میں

شعر میں یہ سادگی اے جوشؔ پھر یہ دل کشی — آپ کی بے رنگیاں بھی رنگ ہیں تصویر میں

(۸۹)

نشانے پر جو تیرے تیر اے عیّار بیٹھے ہیں — قضا کو جیتنے والے بھی ہمّت ہار بیٹھے ہیں

دکھا دے جلوۂ حسنِ حیات افروز ان کو بھی — ادھر بھی اے مسیحا سیکڑوں بیمار بیٹھے ہیں

ضرورت ترکِ مے کی زاہدِ بے کیف کیا جانے — یہ اُن سے پُوچھیے جو بے پیے سرشار بیٹھے ہیں

نکمّا ہو گیا میں اس قدر پامالِ غم ہو کر — مرے اعمال کے کاتب بھی اب بے کار بیٹھے ہیں

ابھی تو منزلِ بیم و رجا کو بھی نہیں چھوڑا — ابھی سے حضرتِ دل آپ ہمّت ہار بیٹھے ہیں

جنابِ شیخ کی میراث اس میں چل نہیں سکتی — ابھی تو گلشنِ جنّت کے ہم حق دار بیٹھے ہیں

حریمِ ناز سے باہر نکل کچھ داد دے ان کو — ترے در تک جو آ پہنچے ہیں منزل مار بیٹھے ہیں

سمجھتے خوب تھے ہم شاطرِ دوراں کی چالوں کو — مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

ہم اُٹھ جائیں تو اُٹھ جائیں مگر یہ اُٹھ نہیں سکتے — ترے سکّے جو دل پر اے جمالِ یار بیٹھے ہیں

دکھا جلوہ کہ خلقت منزلیں طے کر کے آئی ہے — اُٹھا پردہ کہ لاکھوں طالبِ دیدار بیٹھے ہیں

سُنائیں دردِ دل اے جوشؔ کب تک مختصر یہ ہے — بہت غم گیں بہت محزوں بہت لاچار بیٹھے ہیں

(۹۰)

رہ جائے کیوں نہ دب کے تن و توشِ نقشِ پا — اُفتادگی ہے بارِ سرِ دوشِ نقشِ پا

گم گشتگانِ راہِ طلب کے فراق میں
پُرشور بھی ہے عالمِ خاموشِ نقشِ پا

تھک کر بھی ہم نے دم نہ لیا راہِ شوق میں
گو ہر قدم پہ وا ہوئی آغوشِ نقشِ پا

کیا جانے کس نوید کا ارمان تھا انھیں
آواز پر لگے ہی رہے گوشِ نقشِ پا

پامالیوں کی داد ہی دے جائے گا کوئی
فریاد تو کرے لبِ خاموشِ نقشِ پا

یا سب نشانِ بادِ فنا نے مٹا دیئے
یا جانے والوں کو نہ رہا ہوشِ نقشِ پا

اُفتادگی بھی اوج تری رہ گزر میں ہے
جنّت سے کم نہیں مجھے آغوشِ نقشِ پا

واماندگی پہ بھی ہمہ تن چشمِ شوق ہے
دیکھے تو کوئی منظرِ پُرجوشِ نقشِ پا

اے جوشؔ تم صراطِ وفا پر ہو گام زن
لازم ہے ہر قدم پہ تمھیں ہوشِ نقشِ پا

(۹۱)

جفا سہ سہ کے میرا دل تمھارا دل نہ بن جائے
ستم کوشی تمھاری سعیِ لاحاصل نہ بن جائے

مری واماندگی یا رب نئی مشکل نہ بن جائے
کہیں یہ قربِ منزل دوریِ منزل نہ بن جائے

سکونِ یاس میں راحت تو حاصل ہو گئی مجھ کو
مگر ڈر ہے کہ یہ بڑھ کر جمودِ دل نہ بن جائے

تجلّی دیکھ اے مجنوں مگر محتاط بھی ہو جا
نگاہِ شوق بچھ کر پردۂ محمل نہ بن جائے

بھڑکنے دے ذرا اے ضبط میرے سوزِ پنہاں کو
کہیں دب کر چراغِ کشتۂ محفل نہ بن جائے

وہ حسرت کیا جو آنکھوں سے نہ ٹپکے اشک بن بن کر
وہ ارماں کیا جو آخر اضطرابِ دل نہ بن جائے

بہت مشتاق ہے تو امتحانِ سخت جانی کا
ترے دم پر کہیں اے خنجرِ قاتل نہ بن جائے

ہوائے ترکِ رنگ و بو میں یہ بھی سوچ لے واعظ
چمن زارِ جہاں اجڑی ہوئی محفل نہ بن جائے

سعادت اے شوقِ دل کب تک کروں برق رفتاری
مجھے ڈر ہے کہ منزل گور کی منزل نہ بن جائے

نظر کوتاہیِ تقدیر پر اے جوش لازم ہے
تری فریاد بھی اک سعیِ لاحاصل نہ بن جائے

(۹۲)

خدا کے خاص بندے خاص جلوا دیکھ لیتے ہیں
فرشتوں نے بھی جو اب تک نہ دیکھا دیکھ لیتے ہیں

انھیں بندوں کی ہے باریک بینی داد کے قابل
غمِ امروز میں جو عیشِ فردا دیکھ لیتے ہیں

حبابِ مے سمجھتے ہیں سرورِ عیشِ فانی کو
ہم اپنے جام میں انجامِ دنیا دیکھ لیتے ہیں

حجابِ جلوہ کی اہلِ نظر پروا نہیں کرتے
وہ سو پردوں میں ان کا روئے زیبا دیکھ لیتے ہیں

کہاں تک دھوئیں اشکوں سے ہم اپنے امنگوں کو
گھڑی بھر میں نیا داغِ تمنا دیکھ لیتے ہیں

تمہارے جور کا حاصل اگر کچھ ہے تو بس یہ ہے
تماشا دیکھنے والے تماشا دیکھ لیتے ہیں

نظر سے کام لیتے ہی نہیں مشقِ نظر والے
خدا جانے وہ اک جلوے میں کیا کیا دیکھ لیتے ہیں

بہ قدرِ ظرف سب کو دولتِ دیدار ملتی ہے
وہ پہلے حوصلہ تابِ نظر کا دیکھ لیتے ہیں

یہاں تو زندگی بھر ہم رہے اے جوشِ فریادی
چلو محشر میں جو انصاف ہوگا دیکھ لیتے ہیں

(۹۳)

کہاں تک تُو رسا ہے اے مقدّر دیکھ لیتے ہیں
اگر مرنے سے وہ مل جائیں مر کر دیکھ لیتے ہیں

کمالِ عشق پر موقوف ہے رُتبہ شہادت کا
تری تلوار کے جوہر بھی جوہر دیکھ لیتے ہیں

ہمیشہ بجلیاں گرتی نہیں ان کے خرمنِ دل پر
تجھے جو اک نظر اے برق ہنس کر دیکھ لیتے ہیں

تصوّر میں جو طاقت ہے تصوّر میں نہیں آتی
رہو تم لاکھ پردے میں ہم اکثر دیکھ لیتے ہیں

وہی پُرسش وہی بیم و رجا ہر دادخواہی میں
ہم ان کی بزم میں بھی رنگِ محشر دیکھ لیتے ہیں

انھیں سوتے میں بھی ہے دھیان ہم کو قتل کرنے کا
ذرا کروٹ بدلتے ہیں تو خنجر دیکھ لیتے ہیں

ہمیں سرمایۂ عقبیٰ کی جب کچھ فکر ہوتی ہے
تمھارا داغِ اُلفت اپنے دل پر دیکھ لیتے ہیں

فرشتہ موت کا اے جوشؔ آیا یا نہیں آیا
کبھی کچھ ہوش آتا ہے تو اُٹھ کر دیکھ لیتے ہیں

(۹۴)

ساقی یہ کیا کیا کہ نشہ تیز کر دیا
تُو نے کرم بھی اب ستم آمیز کر دیا

ہم نے زمینِ شعر کو زرخیز کر دیا
جو نخل بو دیا وہی گُل ریز کر دیا

اے عشق تُو نے اتنی عطا کی شرابِ غم
پیمانۂ حیات بھی لب ریز کر دیا

جو شانِ حُسنِ گل میں ہے وہ خار میں بھی ہے
میری نظر نے سب کو دل آویز کر دیا

اُجڑے چمن سے کم نہ تھا اے جوشؔ باغِ خلد
رنگینیِ خیال نے گُل ریز کر دیا

فغاں کے ساتھ نالے بھی دلِ مضطر سے نکلے ہیں — برستی آگ میں آفت کے مارے گھر سے نکلے ہیں
کوئی ساعت نہیں ایسی اثر غم کا نہ ہو جس پہ — ہمارے حال کے صیغے اسی مصدر سے نکلے ہیں
نہ دُنیا میں بھی اپنی نہ راس آیا عدم ہم کو — کبھی اس گھر سے نکلے ہیں کبھی اس گھر سے نکلے ہیں
ہماری سخت جانی کی الٰہی آبرو رکھنا — سُنا ہے آج پھر خنجر بہ کف وہ گھر سے نکلے ہیں
ری آتش بیانی شاق گزری اہلِ محفل کو — جلی ہیں اس قدر شمعیں کہ شعلے سر سے نکلے ہیں
نکلنے کی سبیل اے جوشؔ جب کوئی نہیں دیکھی — مرے ارمان آنسو بن کے چشمِ تر سے نکلے ہیں

(۹۶)

ہوں کب تک الٰہی رنج و غم کے امتحانوں میں — مرا حصّہ نہیں کیا تیری رحمت کے خزانوں میں
بر کیا خاک ملتی مجھ کو انجامِ محبت کی — مری تقدیر تو شامل تھی اُن کے ماجرانوں میں
ٹھائیں سُست بُنیادوں نے عالی شان تعمیریں — قضا رہنے بھی دے گی ان مکینوں کو مکانوں میں
د اجانے صبا ہر روز کیا پیغام لاتی ہے — کہ پہروں کانپتے رہتے ہیں تنکے آشیانوں میں
ری گم گشتگی کا ایک اثر اے جوشؔ یہ بھی ہے — مری فریاد بھی گم ہو گئی ہے آسمانوں میں

(۹۷)

کیجئے شاخِ ثمرور کی تلاش — تا بہ کے سرو و صنوبر کی تلاش
بحر و بر میں بے سبب پھرتا نہیں — خضر کرتا ہے سکندر کی تلاش

کیا کہوں راہِ طلب کی مشکلیں — رہ نما کو بھی ہے رہ بر کی تلاش
جستجو ہے یا کوئی دیوانگی — گھر میں رہ کر بھی رہی گھر کی تلاش
سیکھ لے کوئی ہنر اے بے ہنر — عیب کو بھی ہے ہنرور کی تلاش
کوئی کیا سمجھے مری وارفتگی — تیرے گھر میں ہے ترے گھر کی تلاش
یہ زمیں اے جوشؔ کتنی خشک ہے — ہو سکے کیا مصرعِ تر کی تلاش

(۹۸)

موت کی زد کا خطر ہر فرد کو ہر گھر میں ہے — یہ بڑا اک عیب اے دُنیا تری چوسر میں ہے
منزلِ مقصود پر پہنچے تو پہنچے کس طرح — ڈھونڈنے والا امید و بیم کے چکّر میں ہے
شیخ سے کچھ ضد نہیں ہے برہمن سے کد نہیں — دیر و کعبہ دونوں کا جوہر مرے ساغر میں ہے
فکرِ امروز و غمِ فردا سراسر بے محل — تو اگر گھر میں ہے تو سب کچھ ہمارے گھر میں ہے
دَم بخود فتنے ہیں اُن کی شوخیِ رفتار سے — ایک سناٹے کا عالم عرصۂ محشر میں ہے
میری ہی رُودادِ وحشت سُن کے فریادی ہیں سب — چاک میرے ہی جگر کا دامنِ محشر میں ہے
نقشِ اُلفت مٹ گیا تو داغِ اُلفت ہیں بہت — شکر کر اے دل کہ تیرے گھر کی دولت گھر میں ہے
اس سے کیا مطلب کہ ہے کس کس کے دل میں شوقِ قتل — دیکھنا یہ ہے کہ دم کتنا ترے خنجر میں ہے
سلسلہ آوارگی کا فہم سے باہر ہے جوشؔ — میں بھی چکر میں ہوں میری عقل بھی چکر میں ہے

(۹۹)

کیوں کر یہ لکھوں میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا
اس بات پہ میرا تو قلم اُٹھ نہیں سکتا

انکار کو بھی اب تو سمجھتا ہوں میں اقرار
اب آپ کے وعدے کا بھرم اُٹھ نہیں سکتا

اندازِ کرم اُن کے ستم میں بھی ہیں پنہاں
لیکن یہ ستم ہے کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا

سرگرمِ سفر رکھتا ہے دردِ دلِ بے تاب
اُٹھّے نہ اگر یہ تو قدم اُٹھ نہیں سکتا

اُمّید پہ موقوف ہے جاں بازیٔ اُلفت
دل بیٹھ گیا ہو تو ستم اُٹھ نہیں سکتا

جتنا بھی ستانا ہو ستا لو مجھے اک بار
ہر روز تو یہ کوہِ الم اُٹھ نہیں سکتا

کیا خاک کرے راہ نما راہ نمائی
جب ضعف سے میرا ہی قدم اُٹھ نہیں سکتا

فتنے تو اُٹھا سکتے ہو اے شیخ و برہمن
کیا تفرقۂ دیر و حرم اُٹھ نہیں سکتا

کیا جانئے کس خط میں ہے تحریرِ مقدّر
اک حرف سرِ لوح و قلم اُٹھ نہیں سکتا

اے جوشؔ غمِ ہجر ہے وہ سنگِ گراں بار
کتنا ہی اُٹھائیں اسے ہم اُٹھ نہیں سکتا

(۱۰۰)

زخم ہرے نہ ہوں کہیں میرے دلِ فگار میں
پھول کھلیں بہار میں گُل نہ کھلیں بہار میں

لطفِ بہار ہے یہی کیفِ بہار ہے یہی
پھول بھی ہوں بہار میں پھول بھی ہو بہار میں

میرے ہی دل کی ہے گرہ میرے ہی دل کی ہے کلی
جو نہ کھُلی بہار میں جو نہ کھِلی بہار میں

داغِ محن جگر میں ہے داغ فراق دل میں ہے
دیکھئے تو کہاں کہاں پھول کھلے بہار میں

کیا ہو خزاں کا غم مجھے کیا ہو بہار کی خوشی
دل پہ بنی خزاں میں جوشؔ دم پہ بنی بہار میں

(۱۰۱)

داغِ سوزاں شرط ہے رنج و محن کے واسطے
چاہیئے اک شمع بھی اس انجمن کے واسطے

آج تک کوئی نہ سمجھا معنیِ معراجِ عشق
فہم سے بالا رہے دار و رسن کے واسطے

کچھ نہ دیکھا ہم نے غربت میں بجز رنج و محن
لے چلیں کیا چیز یارانِ وطن کے واسطے

ناامیدِ زندگی پر رحم اے دستِ جنوں
یاس کا دامن تو رہنے دے کفن کے واسطے

انتظارِ ابر ہے اے باغباں بے فائدہ
بجلیاں ہیں نونہالانِ چمن کے واسطے

زندگی کی جان ہے اے جوشؔ اسی کی زندگی
جس کا جینا جس کا مرنا ہو وطن کے واسطے

(۱۰۲)

سر جھکا دیتا ہوں حسنِ فتنہ زا کو دیکھ کر
گدگداتی ہے وفا اس بے وفا کو دیکھ کر

دل وہ ہے جو مست ہو دلکش فضا کو دیکھ کر
آنکھ وہ ہے جو چھلک جائے گھٹا کو دیکھ کر

اب تسلی بخش ہے ان کے مریضِ غم کا حال
جان میں جان آگئی شاید قضا کو دیکھ کر

اٹھ گئے محشر خرامی کے فدائی اٹھ گئے
اب ذرا چلنا زمانے کی ہوا کو دیکھ کر

اب وہ حلقے بن گئے ہیں دیدۂ پُر یاس کے
میں نے جو پھندے لگائے تھے ہما کو دیکھ کر

داد کے قابل ہیں اس کی مصلحت اندیشیاں — جس نے توبہ توڑ ڈالی ہو گھٹا کو دیکھ کر
عالمِ حیرت ہی میری منزلِ مقصود تھی — نقشِ پا خود بن گیا ہوں نقشِ پا کو دیکھ کر
بدگمانی نے مری وحشت بڑھا دی اور بھی — اور بھی گم ہو گیا میں رہ نما کو دیکھ کر
وہ گدا ہوں تاجِ شاہی کی ہوس تو درکنار — سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈوں ہما کو دیکھ کر
قتل ہونے کا مجھے اے جوشؔ کچھ سودا نہ تھا — جھک گیا سر خود ہی قاتل کی ادا کو دیکھ کر

(۱۰۳)

رہا پیشِ نظر حسرت کا باب اوّل سے آخر تک — پڑھی کس نے محبت کی کتاب اوّل سے آخر تک
اشارہ تک نہ لکھا کوئی اس نے ربطِ باہم کا — بہت بے ربط ہے خط کا جواب اوّل سے آخر تک
میسّر خاک ہوتا زندگی میں لطفِ تنہائی — رہے دو دو فرشتے ہم رکاب اوّل سے آخر تک
خوشی میں بھی محبت دشمنِ صبر و سکوں نکلی — رہا دل میں وہی اک اضطراب اوّل سے آخر تک
غلط کوشی کی عادت نے اثر پیدا کیا ایسا — غلط نکلا گنا ہوں کا حساب اوّل سے آخر تک
مجھے لے آئی ہے عمرِ رواں کن خارزاروں میں — ہوا ہے چاک دامانِ شباب اوّل سے آخر تک
مجالِ گفتگو پائی تو اب کیوں مُہر بر لب ہے — سُنا دے او دلِ غفلت مآب اوّل سے آخر تک
اندھیرے میں تلاشِ دل اگر ہوتی تو کیا ہوتی — شبِ تاریک تھا دورِ شباب اوّل سے آخر تک
دہانِ زخم سے بھی جوشؔ حالِ دل سُنا دیکھا — نمک پاشی ہی تھا ان کا جواب اوّل سے آخر تک

(۱۰۴)

اسی غزل پر مخمّس

وہی حالِ دلِ ناکامیاب اوّل سے آخر تک   وہی دردِ حدیثِ اضطراب اوّل سے آخر تک
وہی ذکرِ جفا ذکرِ عتاب اوّل سے آخر تک   رہا پیشِ نظر حسرت کا باب اوّل سے آخر تک
پڑھی کس نے محبّت کی کتاب اوّل سے آخر تک

کہیں ہے ذکر جنّت کا کہیں صحرائے اعظم کا   کہیں پریوں کا قصّہ ہے کہیں ابلیس و آدم کا
اڑایا مضحکہ کیسا مرے افسانۂ غم کا   اشارہ تک نہ لکھّا کوئی اس نے ربطِ باہم کا
بہت بے ربط ہے خط کا جواب اوّل سے آخر تک

ہجومِ اہلِ دُنیا سے نہ دم بھر مخلصی پائی   کوئی ان میں شریکِ غم کوئی ان میں تماشائی
تماشا یہ کہ تنہائی میں بھی اک محفل آرائی   میسّر خاک ہوتا زندگی میں لُطفِ تنہائی
رہے وہ دو فرشتے ہم رکاب اوّل سے آخر تک

مسیحا کی مسیحائی بھی اک دردِ دروں نکلی   بہت کچھ حال پُوچھا منہ سے ہاں نکلی نہ ہوں نکلی
تسلّی نام ہے جس کا وہ آزارِ جنوں نکلی   خوشی میں بھی محبّت دشمنِ صبر و سکوں نکلی
رہا دل میں وہی اک اضطراب اوّل سے آخر تک

کسی کو لے گئی بزمِ طرب کے بادہ خواروں میں   کسی کو تاج برسر کر دیا سیمیں عذاروں میں

کسی کو اس نے پہنچایا ہے جنّت کی بہاروں میں
مجھے لے آئی ہے عمرِ رواں کن خارزاروں میں

ہوا ہے چاک دامانِ شباب اوّل سے آخر تک

مرے دستِ تہی نے گنجِ زر پیدا کیا ایسا
خزف نے سنگِ خارا نے گہر پیدا کیا ایسا

کمالِ بے کمالی نے ہنر پیدا کیا ایسا
غلط کوشی کی عادت نے اثر پیدا کیا ایسا

غلط نکلا گناہوں کا حساب اوّل سے آخر تک

سمجھتے ہیں وہ شیدائی تو اب کیوں مہر برلب ہے
تری اُمّید بر آئی تو اب کیوں مُہر برلب ہے

ہوئی جب بزم آرائی تو اب کیوں مُہر برلب ہے
مجالِ گفتگو پائی تو اب کیوں مُہر برلب ہے

سُنا دے او دلِ غفلت مآب اوّل سے آخر تک

مصیبت بے دلی کی مختصر ہوتی تو کیا ہوتی
کوئی تدبیر اپنی کارگر ہوتی تو کیا ہوتی

معاون ڈھونڈنے والی نظر ہوتی تو کیا ہوتی
اندھیرے میں تلاشِ دل اگر ہوتی تو کیا ہوتی

شبِ تاریک تھا دورِ شباب اوّل سے آخر تک

مزاج اُن کا ہمیشہ مائلِ جور و جفا دیکھا
شعار اُن کا ہمیشہ دشمنِ رسمِ وفا دیکھا

اثر کچھ بھی نہیں ہوتا یہ ہم نے بارہا دیکھا
دہانِ زخم سے بھی جوشِ حالِ دل سُنا دیکھا

نمک پاشی ہی تھا اُن کا جواب اوّل سے آخر تک

(۱۰۵)

میرا رونا بھی ہے اک تفسیرِ عشق — ہر گلابی اشک ہے تصویرِ عشق
سخت جاں تھا کیا اثر نخچیرِ عشق — آج تک زندہ ہے کھا کر تیرِ عشق
گورِ مجنوں میں تنِ مجنوں نہیں — دفن ہے زیرِ زمیں توقیرِ عشق
میری صحبت کا اسے حاصل ہے فخر — اوج پر ہے ان دنوں تقدیرِ عشق
دل کے ٹکڑے تُو اُڑا اے تیغِ حسن — کر گیا چھلنی کلیجا تیرِ عشق
زخم ہائے دل سراپا گوش ہیں — اللہ اللہ لذتِ تقریرِ عشق
اُس کی زد سے کوئی کیوں کر بچ سکے — عرش سے ہے فرش تک جاگیرِ عشق
منزلِ جاناں کا کچھ پایا نہ کھوج — ہار تھک کر رہ گیا رہ گیرِ عشق
مر کے ہم آخر رہا ہو ہی گئے — شور کرتی رہ گئی زنجیرِ عشق
دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے جوش — ہم نے دیکھی ہی نہیں تاثیرِ عشق

(۱۰۶)

جس نے دیکھے نہ ہوں دُنیا میں چمن کے ٹکڑے — دیکھ لے آ کے مرے باغِ وطن کے ٹکڑے
گُلشنِ دہر میں ہنسنا بھی ہے اک جُرمِ شدید — ہر کلی مجھ کو دکھاتی ہے دہن کے ٹکڑے
ڈر ہے دل اہلِ وفا کا بھی نہ ٹکڑے کر دیں — میرے مضمونِ غم و رنج و محن کے ٹکڑے

اور جب توڑ حریفوں کو نہ سوجھا کوئی   فعلاتن سے کئے میرے سخن کے ٹکڑے
جابجا کس نے بہلائے ہیں لہو کے آنسو   نظر آتے ہیں بیاباں میں چمن کے ٹکڑے
دردمندوں کو نہ کر مائلِ فریاد اے چرخ   یہ اُڑا دیں گے تری سقفِ کہن کے ٹکڑے
ہم سے پُوچھے تو کوئی اُن کی وفا کی قیمت   بے وفا ہو گئے جو کھا کے وطن کے ٹکڑے
جوشؔ ہر بات پہ کرتے ہیں جو وہ قطعِ کلام   دل کے ٹکڑے کئے دیتے ہیں سخن کے ٹکڑے

(۱۰۷)

اب بھی کچھ بے چین ارمانوں کی شورش دل میں ہے   اب بھی اک ہنگامہ اِس اُجڑی ہوئی محفل میں ہے
دم بخود ہے یاس سے جو بھی تمنا دل میں ہے   منظرِ شہرِ خموشاں اس بھری محفل میں ہے
زندگی ہی سنگِ راہ کعبۂ مقصود تھی   دَم نکلتے ہی مسافر کا قدم منزل میں ہے
اُن کی تیغِ ناز نے اس کے بھی ٹکڑے کر دیئے   شکوۂ جور و جفا کچھ کہہ دیا کچھ دل میں ہے
چارہ گر کو ڈھونڈنے کی اب ضرورت ہی نہیں   وہ چُھری خود چارہ گر ہے جو رگِ بسمل میں ہے
وہ وفا تو چھوڑ بیٹھے تھے جفا بھی چھوڑ دی   دل بھی مشکل میں ہے میری جان بھی مشکل میں ہے
وہ سفر کیا جوشؔ جس کو زندگی طے کر سکے   رہ نوردی کا مزا تو دوریِ منزل میں ہے

(۱۰۸)

مذہب کا حکم یہ کہ معاصی سے دُور ہو   تاکیدِ عشق یہ کہ سراپا قصور ہو

بے تابیِ فراق میں سویا ہی کون تھا — اے شورِ حشر جا مری بالیں سے دُور ہو
قسمت میں مغفرت ہے تو یہ بھی عجب نہیں — گُم دفترِ حساب سے فردِ قصور ہو
یارب خلش کے ساتھ وہ ذوقِ خلش بھی دے — کانٹا چُبھے جگر میں تو دل کو سرور ہو
خالی نہیں ہے جوشِ گُنہ سے کوئی بشر — کس کس پہ مہرباں خدائے غفور ہو

(۱۰۹)

اُدھر نیام سے تیغِ جفا نکلتی ہے — اِدھر کسی کے دہن سے دعا نکلتی ہے
اُٹھا جو بزم سے ان کی تو یہ ہوا ارشاد — ہزار شکر کہ گھر سے بلا نکلتی ہے
تمھارے چاہنے والوں کو مرگ سے کیا خوف — تمھارے کُوچے سے بچ کر قضا نکلتی ہے
کسی کے تیرِ ستم میں وہ لذتیں پائیں — دہانِ زخم سے اب تک دعا نکلتی ہے
مزا تو جب ہے کہ نکلیں نہالِ غم سے ثمر — اگر نکلتی ہے کونپل تو کیا نکلتی ہے
فلک سے ٹوٹ کے گرتی ہیں بجلیاں اے جوشؔ — بہار میرے چمن میں جو آ نکلتی ہے

(۱۱۰)

سیکڑوں بھُولے ہوئے غم یاد کر لیتا ہوں میں — اپنی دُنیا آپ ہی آباد کر لیتا ہوں میں
خُون رو رو کر سُناتا ہوں بیانِ عاشقی — اس طرح رنگین یہ رُوداد کر لیتا ہوں میں
بدگمانی سے مٹاتا ہوں طلسمِ آرزو — اپنی محنت آپ ہی برباد کر لیتا ہوں میں

مکتبِ غم میں بڑا مشکل جفا کا درس ہے
کچھ بھلا دیتا ہوں میں کچھ یاد کر لیتا ہوں میں

اس میں کیا نقصان ہوتا ہے ترا اے باغباں
باغ میں دم بھر اگر فریاد کر لیتا ہوں میں

خوں کے آنسو بہائے میری ناکامی پہ تو
تیرا ماتم اے دلِ برباد کر لیتا ہوں میں

اک نہ اک جھگڑا پرانا یاد کر لیتے ہیں وہ
اک نہ اک شکوہ نیا ایجاد کر لیتا ہوں میں

جوشؔ ان بے ہوشیوں سے فائدہ اتنا تو ہے
قیدِ غم سے رُوح کو آزاد کر لیتا ہوں میں

(۱۱۱)

مرنے والوں کا نقشِ پا نہ مِلا
خضر کو کوئی رہ نما نہ مِلا

غم ہے اس کا کہ دل رہا نہ مِلا
دل کا کیا ہے مِلا مِلا نہ مِلا

ہم نے عادت بگاڑ دی اُن کی
مُدعی کو بھی مُدعا نہ مِلا

دید سے اک ہمیں رہے محروم
کس سے وہ عالم آشنا نہ مِلا

نیند آئے تو کس اُمید پہ آئے
خواب میں بھی وہ بے وفا نہ مِلا

بے خودی میں تلاشِ دل کیسی
مجھے اپنا بھی کچھ پتا نہ مِلا

ہجر میں کون ہو رفیق اے جوشؔ
قافیہ اس کے ساتھ کا نہ مِلا

(۱۱۲)

نالۂ جاں گداز نے مارا
سوزِ اُلفت کے ساز نے مارا

یہ کہا پڑھ کے میرا نامۂ شوق — اس سراپا نیاز نے مارا
منہ سے اُف بھی تو کر نہیں سکتے — خوفِ افشائے راز نے مارا
زندگی چین سے گزرتی تھی — چشمِ نظارہ باز نے مارا
داد بھی شوقِ دید کی نہ ملی — جلوۂ بے نیاز نے مارا
موت کی زد سے بچ گیا جو کوئی — اُس کو عمرِ دراز نے مارا
اُنگلیاں ہر طرف سے اُٹھتی ہیں — طرّۂ امتیاز نے مارا
کوئی دم ساز کوئی ہے جاں باز — آپ کے ساز باز نے مارا
جس کے قبضے میں ہے مسیحائی — ہم کو اُس تیغِ ناز نے مارا
کیا بھروسا کسی پہ ہو لے جوشؔ — دل کو اک دل نواز نے مارا

(۱۱۴)

سارے عالم کو پلایا تُو نے آبِ زندگی — ایک چھینٹا اس طرف بھی اے سحابِ زندگی
رنجِ دُنیا خوفِ عقبیٰ بارِ غم فکرِ نجات — ایک جانِ ناتواں پر سو عذابِ زندگی
دل لگی سُوجھی یہ کیا اے ساقیِ بزمِ حیات — موت کے ساغر میں بھر کر دی شرابِ زندگی
زندہ رہنے کی تمنّا زندگی سے کم نہیں — یہ سوالِ زندگی خود ہے جوابِ زندگی
موج کا کیا ذکر ساحل بھی ہے گردابِ فنا — کون سی اُمّید پر اُبھرا حبابِ زندگی

عیش کے انجام سے دم بھر نہ جو غافل رہا
عینِ بیداری ہے اُس انساں کا خوابِ زندگی

پیرِ میخانہ کی صحبت جوشؔ کیا پُر لطف ہے
جھومتے دیکھا نہیں ہم نے شبابِ زندگی

(۱۱۴)

میری وحشت کا اثر میرے ہی دامن میں نہیں
کون سا پھول ہے صد چاک جو گلشن میں نہیں

پھول تُربت پہ چڑھانے کے لئے آتا ہے
شکر ہے اب کوئی کانٹا دلِ دشمن میں نہیں

ہوش میں بھی نہ گیا عالمِ وحشت کا اثر
ہے کلیجے میں وہی چاک جو دامن میں نہیں

کفِ افسوس ہی ملتا مری بربادی پر
کوئی پتّا بھی تو اب شاخِ نشیمن میں نہیں

تیغِ قاتل مری گردن پہ جھکی پڑتی ہے
کون کہتا ہے محبّت دلِ آہن میں نہیں

اس قدر رہتی ہے نادیدہ بلاؤں کی ہوس
گردن اس طوق میں ہے طوق جو گردن میں نہیں

اشکِ خونیں جسے آنکھوں سے بہا آئے ہیں
وہ پسِ مرگ بھی گلشن میں ہے مدفن میں نہیں

سب پہ برسا ہے ترا ابرِ کرم اے ساقی
میرے حصّے کی کوئی بوند بھی ساون میں نہیں

خاک ساری نے مجھے پاک بنایا اے جوشؔ
ایک بھی داغِ رعونت مرے دامن میں نہیں

(۱۱۵)

اُن کی نگاہِ ناز سے ہے شانِ آرزو
روشن ہے بجلیوں سے شبستانِ آرزو

سو بار دن بہار کے آئے گزر گئے
پھولا نہ ایک دن بھی گلستانِ آرزو

اُس بزم سے نکل کے ٹھکانا نہیں رہا / اب ہم ہیں اور گوشۂ دامانِ آرزو

اے یاس تو ہی مجھ کو دکھا ساحلِ مراد / مجھ کو ڈبوئے دیتا ہے طوفانِ آرزو

یہ آرزو ہے اے دلِ بے آرزو مری / دم بھر تو کر لوں سیرِ گلستانِ آرزو

باقی رہا نہ جوشؔ کوئی شہسوارِ شوق / اب خاک اُڑتی ہے سرِ میدانِ آرزو

(۱۱۶)

عقل سے کیا پوچھتا آفت کو سر پر دیکھ کر / وہ تو خود چکرا گئی قسمت کا چکّر دیکھ کر

پھول جو پھولا چمن میں داغ دل پر لے گیا / گلشنِ دنیا کا حسرت ناک منظر دیکھ کر

سخت جاں ہوں دست و بازو کا بھرم کھل جائے گا / وار کرنا سوچ کر بچ کر سنبھل کر دیکھ کر

سیرِ دنیا کا مزا شاید اسی پر ختم ہے / جو بلا آتی ہے جاتی ہے مرا گھر دیکھ کر

چند آنسو تھے جو رُخ پر آب بن کر رہ گئے / آئینہ رویا تھا انجامِ سکندر دیکھ کر

اپنی ناداری ہی غیرت سے پسند آئی مجھے / روزیٔ انساں کے حصّے نا برابر دیکھ کر

توڑ کر توبہ ندامت تو مجھے ہوتی ہے جوشؔ / کیا کروں نیّت بدل جاتی ہے ساغر دیکھ کر

(۱۱۷)

اُلجھ کر پاؤں میں پھندا بنا ہے چاکِ دامن کا / غضب ہے چاک دامن کا بلا ہے چاک دامن کا

جب آنکھوں کو پسند آیا تو کیا حاجت رفوگر کی / نظر کے تار سے ہم نے سیا ہے چاک دامن کا

یہ اچھّی دوست داری ہے یہ اچھّی غم گساری ہے
مری تقدیر سے اُلجھا ہوا ہے چاک دامن کا

مجھے آلودۂ عصیاں سمجھ کر دُور رہتا ہے
بڑا اب پاک دامن بن گیا ہے چاک دامن کا

جنوں کی چیرہ دستی زندگی کے ساتھ جائے گی
عدم آباد کی حد سے ملا ہے چاک دامن کا

قیامت ہے کہ پھر تاکیدِ حفظِ راز ہے مجھ کو
مصیبت ہے کہ پھر سینا پڑا ہے چاک دامن کا

نہیں معلوم اس کی انتہا کس چاک تک پہنچے
مرے جوشِ جنوں کی ابتدا ہے چاک دامن کا

نگاہوں سے اُتر کر بھی نہ اُترا میری گردن سے
گلے کا ہار بن کر رہ گیا ہے چاک دامن کا

ضرورت خضر کی اے جوشؔ کیا صحرائے وحشت میں
بھٹک جاؤں تو میرا رہنما ہے چاک دامن کا

(١١٨)

نالہ دلِ حزیں کا ہم آہنگِ صُور تھا
یارب شبِ الم تھی کہ روزِ نشور تھا

اُلفت کی خامیوں کا یہ سارا فتور تھا
میرا قصور تھا نہ تمھارا قصور تھا

محشر میں بھی وہی تھیں مری مے پرستیاں
ہاتھوں میں میرے جامِ مئے یا غفور تھا

کیا خاک اُس کے قرب کی ہوتی مجھے اُمید
آنکھوں میں رہ کے بھی جو نگاہوں سے دُور تھا

مجھ کو بچا لیا لبِ شیریں کے فیض نے
باتوں میں تم نے زہر ملایا ضرور تھا

موسیٰ کی چشمِ شوق نہ تھی طالبِ جمال
ہر سنگ ورنہ آئینۂ برقِ طور تھا

انکار کیجئے نہ کمالاتِ جوشؔ سے
کم گو سہی مگر وہ سخن ور ضرور تھا

(۱۱۹)

انگارے بن گئے گلِ تر شاخسار میں
گلشن کو کس نے آگ لگا دی بہار میں

سیرت کے ساتھ غصّے میں صورت بدل گئی
پوشیدہ خود وہ ہو گئے دل کے غبار میں

نکلا ہوں میں نحیف گلستاں سے اس لئے
کانٹا چبھے نہ پائے نسیمِ بہار میں

تقدیر پر اگر مجھے قدرت نہ دی تو خیر
کم بخت دل تو ہوتا مرے اختیار میں

ہوتی ہے چشمِ طور کا سُرمہ اُنھیں کی خاک
جو خاک ہو گئے ہیں تری رہ گزار میں

ہر ایک پھول ہنستا ہے بلبل کی عقل پر
کم بخت روتی رہتی ہے فصلِ بہار میں

اے جوشؔ دل کی سوختہ سامانیاں نہ پوچھ
اب خاک اُڑ رہی ہے اس اُجڑے دیار میں

(۱۲۰)

جستجو سے عقلِ انساں اور سودائی ہوئی
ہر شناسائی سے پیدا ناشناسائی ہوئی

گلشنِ عیش و طرب افسوس کیسا لُٹ گیا
اک کلی دل کی ہے باقی وہ بھی مُرجھائی ہوئی

کون جانے اس میں کیا کیا رازِ الفت بند ہیں
ایک دفتر ہے کسی کی آنکھ شرمائی ہوئی

مل گئی حُسنِ طلب کو دولتِ حُسنِ قبول
عرش سے میری دعا اُتری ہے اِترائی ہوئی

ماہِ نو پر بھی اُٹھی ہیں ہر طرف سے اُنگلیاں
جو کوئی دُنیا میں آیا اس کی رسوائی ہوئی

میری ذاتِ غیر فانی میں فنا کو دخل کیا
اے اجل آئی یہاں تو کس کی بہکائی ہوئی

رات دن کے رنج و غم میں کوئی کب تک ساتھ دے — جان بھی اب جسم میں ہے سخت گھبرائی ہوئی
ایک میلا سا مضامیں کا لگا رہتا ہے جوشؔ — انجمن سے بڑھ کے مجھ کو میری تنہائی ہوئی

(۱۲۱)

روز ساقی مئے اندوہ ربا دیتا ہے — نہ ملے جام تو آنکھوں سے پلا دیتا ہے
ایک تم ہو جو مرے دل پہ بنا دیتے ہو — ایک دل ہے جو مرے دم پہ بنا دیتا ہے
اور ہوگا کوئی ہنستوں کو رلانے والا — اس پہ مرتا ہوں جو روتوں کو ہنسا دیتا ہے
دیکھ کر کس رخِ رنگیں کو میں بے ہوش ہوا — ہر گلِ تر مجھے دامن کی ہوا دیتا ہے
میں ہوں وہ وار فلک کا کبھی چلنے ہی نہ دوں — اس کا جھکنا مری گردن کو جھکا دیتا ہے
لذتِ زیست مجھے ہائے کہاں سے آئی — جس سے ملتا ہوں وہ پیغامِ قضا دیتا ہے
چشمِ ساقی کے تصور کا بہت ہوں ممنون — جب کبھی آتا ہے دو گھونٹ پلا دیتا ہے
ہائے وہ جلوہ نظر بھر کے میں دیکھوں کیوں کر — جو مجھے بھی مری نظروں سے چھپا دیتا ہے
چٹکیوں میں مرا دل جس نے اڑا لیا ہے جوشؔ — اب مری بات کو باتوں میں اڑا دیتا ہے

(۱۲۲)

فلک سے کم نہیں فتنے اٹھائے اے زمیں تو نے — لحد میں خاک کر ڈالے ہیں لاکھوں مہ جبیں تو نے
مگس رانی کی خدمت سونپ دی میں نے سلیماں کو — مرے بازو پہ پھیلا دی جو زلفِ عنبریں تو نے

نیا زو نانے کے عالم نے یہ تکرار پیدا کی
ابھی مکتب میں سیکھی آ کے ہاں ہیں نے نہیں تُو نے

مری بگڑی کو بھی یارب بنا دے گا تو جانوں گا
بنانے کو بنایا آسماں تُو نے زمیں تُو نے

مری آہیں تجھے صدہا نئے عالم دکھا دیں گی
ابھی دُنیا کہاں دیکھی ہے اے چرخِ بریں تُو نے

نہ پُوچھ اے داورِ محشر کہ ظالم کون تھا ایسا
وہی جس کو بنایا تھا حسین و نازنیں تُو نے

غضب ہے اس خطا پر مجھ کو پھر بے دردے مارا
کہ میرے دست و بازو پر کہی کیوں آفریں تُو نے

زمانہ داد دے گا جوشؔ اس جادُو بیانی پر
طبیعت پائی ہے واللہ کیا سحر آفریں تُو نے

(۱۲۳)

رُسوا کہیں جہان میں وہ فتنہ گر نہ ہو
کرتا ہوں یہ دعا کہ دعائیں اثر نہ ہو

رندوں میں کیوں شمار ہے مجھ بے گناہ کا
اتنی تو پی تھی جس سے کہ دامن بھی تر نہ ہو

اب وہ بھی میرے دل کی طرح بے قرار ہیں
یہ شوق وہ نہیں جو اِدھر ہو اُدھر نہ ہو

آتا ہے جذبِ دل کو وہ اندازِ مے کشی
رندوں میں رند بھی رہیں دامن بھی تر نہ ہو

ہر چارہ گر کو دیکھ کے یہ سوچتا ہوں جوشؔ
عیسیٰ کے بھیس میں کوئی بے داد گر نہ ہو

(۱۲۴)

کیا بات ہے دیدار تمھارا نہیں ہوتا
روشن مری قسمت کا ستارا نہیں ہوتا

اُس بزم میں رنگینیٔ صُحبت نہیں رہتی
جس بزم میں کچھ ذکر ہمارا نہیں ہوتا

مقتل کو سمجھتے ہیں وہ اک ناز کی محفل / بسمل کا تڑپنا بھی گوارا نہیں ہوتا

کچھ راز کی باتیں ہیں سنائیں اسے کیوں کر / تنہا کبھی وہ انجمن آرا نہیں ہوتا

بجلی کے چمکنے سے کڑکتی ہیں فضائیں / دم بھر کا تبسم بھی گوارا نہیں ہوتا

کیوں عید کا تم چاند بنے رہتے ہو اے جوشؔ / کیا بات ہے دیدار تمھارا نہیں ہوتا

(۱۲۵)

مصیبت کی ساعت گزر جائے گی / یہ آندھی بھی آخر اتر جائے گی

نہ جاگیں گے ہم خفتگانِ عدم / قیامت بھی سر سے گزر جائے گی

چھڑائے گا بلبل کو آفت سے کون / قفس ہی میں گھُل گھُل کے مر جائے گی

تمھارے مکرنے سے ہوتا ہے کیا / یہ شمشیر بھی کیا مکر جائے گی

مری بدگمانی نہ چھوڑے گی ساتھ / جدھر جاؤ گے تم اُدھر جائے گی

نہ ٹھہرے گی سینے پہ تصویرِ یار / پری بن کے دل میں اتر جائے گی

نیا شغل اے جوشؔ ڈھونڈو کوئی / محبت کی بازی تو ہر جائے گی

(۱۲۶)

ناتوانی میں ہوئے ہیں جان سے بے زار ہم / اپنی ہی آنکھوں میں کھٹکے ہیں مثالِ خار ہم

تُو وہ یوسف ہے ترا ثانی کہیں پایا نہیں / چھان آئے آج سارا مصر کا بازار ہم

ناتواں اتنے ہیں تن میں بوجھ تک باقی نہیں
چشمِ دشمن پر بھی دنیا میں نہیں ہیں بار ہم

ہجر کی بے خوابیاں لاکھوں پہ احساں کر گئیں
بن گئے ہیں دشمنوں کا طالعِ بیدار ہم

چشمِ غفلت کی گراں خوابی ہی سنگِ راہ ہے
اپنے رستے میں ہوئے ہیں آپ ہی دیوار ہم

خود پرستی ہی کو جانا حاصلِ دنیا و دیں
ڈوب کر دریا میں سمجھے ہیں کہ پہنچے پار ہم

نقدِ دل کا ہوش کس کو نقدِ جاں باقی نہیں
راکھ جل کر ہو گئے اے گرمیِ بازار ہم

کون ہے اے جوشؔ اب حسنِ سخن کا قدرداں
جی میں آتا ہے جلا دیں دفترِ اشعار ہم

(۱۲۷)

حد ہو گئی حجاب کی اب کیا کرے کوئی
کہتے ہیں خواب میں بھی نہ دیکھا کرے کوئی

کب تک جفائے غیر کا شکوا کرے کوئی
کب تک بُروں کی جان کو رویا کرے کوئی

جس کا مقام وہم و گماں بھی نہ پا سکیں
کیا اس کو دیکھنے کی تمنا کرے کوئی

اے ہم نشیں یہ قول یہ ارشاد ہے بجا
دل ہی نہ مانتا ہو تو پھر کیا کرے کوئی

آخر جنابِ جوشؔ بھی خاموش ہو گئے
کب تک کسی کے جور کا شکوا کرے کوئی

(۱۲۸)

دشمن کا ناز ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا
یہ زہر جیتے جی کبھی کھایا نہ جائے گا

تُربت میں جسم جائے گا سایا نہ جائے گا
کوئی بھی ساتھ اپنا پرایا نہ جائے گا

وہ دن گئے جب آپ کے وعدوں پہ تھا یقیں / اب دل کو چٹکیوں میں اُڑایا نہ جائے گا

مجھ ناتواں کو چھیڑ نہ اے انتہائے یاس / احسانِ موت مجھ سے اُٹھایا نہ جائے گا

تاکیدِ حفظِ راز سے مُنہ پر لگی ہے مُہر / قصّہ شبِ الم کا سُنایا نہ جائے گا

او مست ناز ڈر کسی بےکس کی آہ سے / بھڑکا اگر یہ شعلہ بجھایا نہ جائے گا

پردہ اُٹھائیے رُخِ انور دکھائیے / یہ درد تو نہیں جو دکھایا نہ جائے گا

بن کر سرور ہوگا نگاہوں سے آشکار / آنکھوں میں بھی وہ شوخ چھپایا نہ جائے گا

خُم ہی لگا دو مُنہ سے کہ رعشہ بدست ہیں / چُلّو کا جام مجھ سے بنایا نہ جائے گا

تیرِ قضا کا ڈر ترے مہجور کو ہو کیوں / یہ زہرِ غم نہیں ہے جو کھایا نہ جائے گا

اُن کی نظر کے تیر قیامت سے کم نہیں / پتھّر کا دل بھی ہو تو بچایا نہ جائے گا

سرقہ نہاں رہے گا نہ اہلِ نظر سے جوش / چوری کا مال گھر میں چھپایا نہ جائے گا

(۱۲۹)

آئی بہار کھل گئے باغِ سخن کے پھول / بےرنگ و بو نہ ہوں گے کبھی اس چمن کے پھول

تیرے ہی فیضِ حُسن سے پاتے ہیں آب و تاب / دریا کے موتی کان کے جوہر چمن کے پھول

کیا بےکسی ہے سوکھ کے کانٹا بھی ہو گئے / لایا نہ بےستوں سے کوئی کوہ کن کے پھول

زخموں کی میرے تن پہ بہاریں تو آ کے دیکھ / دیکھے تو کیا سُنے بھی نہ ہوں گے بدن کے پھول

رندوں نے زاہدوں کے مزاروں پہ رکھ دیئے
گنگا گئے نہ مستِ شرابِ کہن کے پھول

گل چیں کی دستبرد کا ہم کو نہیں ہے خوف
شاخِ بلند پر ہیں ہمارے چمن کے پھول

ہاں گرمیِ کلام جلا دے خزاں کے ہاتھ
شعلے سے کم نہ ہوں مرے باغِ سخن کے پھول

تھوڑا سا زر تھا مٹھی میں وہ بھی نہیں رہا
ہنستا ہے اپنی عقل پہ ہر غنچہ بن کے پھول

روکے سے باغباں کے نہ لے جوش ہم رکے
چن چن کے توڑ لائے نہالِ سخن کے پھول

(۱۳۰)

ہنگامِ دید نکلی ہے کیا کیا سخن کی شاخ
کافر کی آنکھ میں ہوئی پیدا دہن کی شاخ

گل ہائے تازہ تر سے طبیعت ہے گلشن کی شاخ
پھولوں سے لد گئی ہے نہالِ سخن کی شاخ

موجِ صبا سے کم نہیں بلبل کا اضطراب
جھولا بنی ہوئی ہے گلِ خندہ زن کی شاخ

پیری میں فنِ شعر کی ہوتی ہے پختگی
پھلتی ہے اس چمن میں نہالِ کہن کی شاخ

بچ جائے کوئی قیدِ علائق سے کس طرح
مر کر بھی ہے لگی ہوئی گور و کفن کی شاخ

قشقہ ہو برہمن کا کہ شملہ ہو شیخ کا
دونوں کو سمجھو نخلِ فریب و فتن کی شاخ

اے شمعِ حسن تیری تجلی کہاں نہیں
انجم کی بزم بھی ہے تری انجمن کی شاخ

ہر دم نئے نئے ہیں ستم کوئے یار میں
گویا ہے یہ زمین بھی چرخِ کہن کی شاخ

بلبل فغاں بہ لب ہے تو قمری ہے نوحہ خواں
پھوٹی کہاں کہاں مرے درد و محن کی شاخ

اے جوشؔ فیضِ ابرِ طبیعت کا دیکھنا — سرسبز ہو گئی ہے نہالِ سخن کی شاخ

(۱۴۱)

بحرِ دُنیا سے کنارا چاہیئے — عُمر ساحل پہ گزارا چاہیئے

زندۂ جاوید ہونے کے لئے — نفسِ امّارہ کو مارا چاہیئے

دار پر چڑھ کر کہا منصور نے — راستی شیوہ ہمارا چاہیئے

ڈوبنے والوں کو کشتی کیا ضرور — اُن کو تنکے کا سہارا چاہیئے

برق کی چشمک کو اے مغرور دیکھ — عقل مندوں کو اشارا چاہیئے

بے بصر بے دست بے دل بے زباں — کچھ توان چاروں کا چارا چاہیئے

فقر میں فاقے میں غم میں عیش میں — جس طرح گزرے گزارا چاہیئے

چہرۂ ظاہر پہ مانندِ گہر — حُسنِ باطن آشکارا چاہیئے

گنجِ قاروں کی ہوس بے فائدہ — ہم کو دو دن کا گزارا چاہیئے

کھیل میں ضائع نہ کر عمرِ عزیز — بازیِ طفلاں کو ہارا چاہیئے

بحرِ ہستی جوشؔ طوفاں خیز ہے — صورتِ ساحل کنارا چاہیئے

(۱۴۲)

شش جہت نہ فلک آئیں گے نظر $\frac{۲}{۳}$ — $\frac{۶}{۹}$ کے برابر ہے اگر $\frac{۲}{۳}$

دو کھلونے جو کبھی ہم نے تپائی پہ دھرے　　آگئے صاف مہندس کو نظر ۲/۳

بیسویں رات مہینے کی جب آجاتی ہے　　غم میں رہ جاتا ہے گھل گھل کے قمر ۲/۳

ظالمو خوف کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر　　لفظِ اللہ میں ہے اس کا اثر ۲/۳

رہ گیا ۱/۳ ہی اب صبر و سکوں　　لے گئی آپ کی دزدیدہ نظر ۲/۳

طالب خیر نہ ہوں گے کبھی انسان سے ہم　　نام ہے اس کا بشر اس میں ہے شر ۲/۳

منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولت مندی　　دیکھ لو زور میں موجود ہے زر ۲/۳

ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہیں کون　　جس کو کہتے ہیں نڈر اس میں ہے ڈر ۲/۳

کھوتی منزل کئے دیتی ہے تو اے شامِ شباب　　راہ رَو کا ابھی باقی ہے سفر ۲/۳

۲/۳ کی رکھی ہے جو اسے جوشؔ ردیف　　شعر بھی نکلے ہیں مقبولِ نظر ۲/۳

(۱۳۳)

دیوار بنا کر لاکھ کرے مالی رکھوالی پھولوں کی
بلبل کی فغاں سے پہلے کر اُڑ جائے گی لالی پھولوں کی

برسا ہے کچھ ایسا نور یہاں بے نور ہے شمعِ طور یہاں
تنویر کی ہر اک دنیا سے دنیا ہے نرالی پھولوں کی

ہر شاخِ چمن جھک جاتی ہے ہر موجِ رواں رُک جاتی ہے
گُلشن میں نمایاں ہوتی ہے جب شانِ جلالی پھُولوں کی

جس پردہ نشیں کے پردے کو اک حُسن کا دامن کافی تھا
گُل زار میں اُس شرمیلے نے دیوار بنالی پھُولوں کی

اے مالی باڑی چور بہت ہر روز چمن میں آتے ہیں
لُٹ جائے نہ دولت شاخوں کی اُڑ جائے نہ لالی پھُولوں کی

یہ فصلِ بہاری آئی ہے یا فصلِ بہاری چھائی ہے
ہر ڈالی باغ ہے پھُولوں کا ہر باغ ہے ڈالی پھُولوں کی

اے حُسن تجھے لے آئی ہے بازار میں رُسوا کرنے کو
کچھ حرص پرستی گُل چیں کی کچھ خام خیالی پھُولوں کی

اے جوشؔ بہت سے پھولوں کو کس رنگ سے تم نے باندھا ہے
یہ قید نہیں یہ بندھ جانا ہے خوش اقبالی پھُولوں کی

(۱۳۴)

پُوچھتے ہیں قعرِ دریا میں لبِ ساحل سے ہم	کچھ بتا دے ہم کو کتنی دُور ہیں منزل سے ہم
بحرِ دُنیا کو جو پایا ڈوب مرنے کا مقام	رہ گئے ٹکرا کے موجوں کی طرح ساحل سے ہم

گور کی منزل بھی نکلی اک مقامِ امتحاں — خاک میں مل کر بھی کوسوں دُور ہیں منزل سے ہم
آندھیوں نے پیس کر سرمہ بنا ڈالا ہمیں — پہنچے ہیں اُس شوخ کی آنکھوں میں کس مشکل سے ہم
جوشِ گردابِ فنا کی یاد میں یہ حال ہے — پار ہو کر ڈوبتے ہیں خمیازۂ ساحل سے ہم

(۱۳۵)

زمانہ سازیوں سے بندہ پرور ہم کو نفرت ہے — بھری محفل میں منہ پر صاف کہہ دینے کی عادت ہے
نہیں دیکھے تڑپتے یہ کبھی شوقِ حضوری میں — ترے پروانوں کو اے شمع منہ دیکھے کی اُلفت ہے
گنہ گاری کے دفتر بہہ گئے ہیں اس کی موجوں میں — مرا اشکِ ندامت ہے کہ اک دریائے رحمت ہے
دلِ محزوں کے نالے کم نہیں ہیں شورِ محشر سے — الٰہی شامِ فرقت ہے کہ یہ صبحِ قیامت ہے
مصیبت میں رہے ہم جوش محرومِ اجل ہو کر — ہمارا بچ کے آفت سے بچ جانا بھی آفت ہے

(۱۳۶)

بندۂ مُہر بہ لب ہوں میں ثنا خواں تیرا — دل میں رکھتا ہوں مقفّل غمِ پنہاں تیرا
زندگی کچھ بھی نہیں سوزِ محبّت کے بغیر — آگ اُس دل کو لگے جو نہیں خواہاں تیرا
قُلزمِ عشق کے طُوفان سے بچنا معلوم — اے دلِ زار اب اللہ نگہباں تیرا
کیوں گُلِ تر کو میں آئینہ سے تشبیہ نہ دوں — اس میں آتا ہے نظر چہرۂ خنداں تیرا
نہیں اک بلبلِ تصویر ہی محوِ حیرت — دیدۂ مرغِ نگہ تر بھی ہے حیراں تیرا

حوضِ کوثر بھی ہو اس جام پہ صدقے سو بار — جس میں تجھ کو نظر آئے رُخِ تاباں تیرا
حضرتِ جوش مرے شوقِ طلب کے ہیں گواہ — شعر بھی کوئی نکلتا ہے تو جویاں تیرا

نوٹ۔ یہ پہلی غزل ہے جو حضرت داغ کی خدمت میں برائے اصلاح بھیجی گئی تھی ۱۹۰۱ء

(۱۳۷)

اُن کی بے داد کا بھی داد طلب ہو جانا — میری فریاد کا بھی سوء ادب ہو جانا
ہم سمجھتے ہیں اُسی شوقِ طلب کو صادق — جس نے سیکھا نہیں دامانِ طلب ہو جانا
حُسن کی شان یہی ہے کہ وہ فاتح ہی رہے — تم کو زیبا نہیں مغلوبِ غضب ہو جانا
اس قدر پاس ہے پردے کا تو ہم دیکھیں گے — خود تری آنکھ کا دیدار طلب ہو جانا
یہ کرشمہ بھی ترا عکس دکھاتا ہے مجھے — ایک آئینے کا بازارِ حلب ہو جانا
ہنستے تھے رنج و الم بھی مری نادانی پہ — اک تماشا تھا مرا محوِ طرب ہو جانا
راز دل کا نہ چھپائے سے چھپے گا اے جوش — اک تکلم ہے مرا مُہر بہ لب ہو جانا

(۱۳۸)

صبر و سکوں مرے دلِ مشتاق میں کہاں — یہ درس اس کتاب کے اوراق میں کہاں
غم تزکیہ ہے نفس کا اے طالبِ خوشی — اس زہر میں جو بات ہے تریاق میں کہاں
منظور سیرِ گل ہے تو دیکھ آکے دل کے داغ — پھول اس ادا کے گلشنِ آفاق میں کہاں

تاخیر کیوں نقاب اُٹھانے میں اس قدر — تاب انتظار کی ترے مشتاق میں کہاں

چھائی ہے میں نے عالمِ حیرت کی خاک بھی — ڈھونڈوں اب اس کو عرصۂ آفاق میں کہاں

اللہ رے ادائے تغافل کی دل کشی — یہ لُطف یہ مزا ترے اشفاق میں کہاں

ترکِ مبالغہ بھی ہے لازم سخن میں جوشؔ — جو بات سادگی میں ہے اغراق میں کہاں

ابتدائی کلام کا انتخاب

بادۂ عیش کی میں خاک تمنا کرتا
وہم تھا زہر نہ بھر دے کوئی پیمانے میں

مرحبا کے لئے ہر جام نے لب کھول دئے
توبہ توڑی کسی تائب نے جو مے خانے میں

وہ تو وہ اُن کا تصور بھی گریزاں ہی رہا
کون ٹھہرے مرے اُجڑے ہوئے کاشانے میں

بادۂ تند کی موجوں سے یہ کھٹکا ہے مجھے
آبرو ڈوب نہ جائے کہیں پیمانے میں

محفلِ عیش میسر ہے جنوں میں بھی مجھے
رقص کرتے ہیں بگولے مرے ویرانے میں

ایک دن غافل فراقِ جان و تن ہو جائے گا
حرص کا پھیلا ہوا دامن کفن ہو جائے گا

کار فرما اُن کی برقِ حسن کو ہونے تو دو
جل کے خاکستر طلسمِ ما و من ہو جائے گا

مجھ پہ جو گزری کہے گی خود سفر کی خستگی
پاؤں کا ٹوٹا ہوا چھالا دہن ہو جائے گا

آئینہ دیکھو نہ ہنس ہنس کر غرورِ حسن سے
خود تمہارا عکس تم پر خندہ زن ہو جائے گا

یاد بھی اُس گُلِ نازک کی اُٹھی یہ کہہ کر
کون بیٹھے ترے چھٹتے ہوئے ارمانوں میں

مِل ہی جائے گی تجھے آبِ بقا کی کوئی بوند
اے سکندر مرے ٹوٹے ہوئے پیمانوں میں

دل لگانے کی جو عادت نہیں تجھ کو نہ سہی
آگ ہی آ کے لگا جا مرے ارمانوں میں

پی گیا کون مئے عیش کو اے ساقیِ چرخ
بوند بھی اب نہیں باقی ترے پیمانوں میں

ہوا ضبطِ گریہ سے بے فائدہ
کہ شاخِ مژہ بے ثمر ہو گئی

بلا تھیں شبِ غم کی تاریکیاں
خدا جانے کیوں کر سحر ہو گئی

سرِ شام وہ میرے گھر آ گئے
دعائے سحر کارگر ہو گئی

نہ پوچھو کہ ہوش اُڑ گئے کس طرح
تمہاری نگہ بال و پر ہو گئی

آ پہنچی لب پہ آہ دلِ بے قرار کی
اے بلبل اب تو خیر منا لے بہار کی

رسوا نہ ہو فلک پہ مرا نالہ اے اثر
ہے تیرے ہاتھ شرم غریب الدیار کی

میری ہی زندگی کی قسم کھائی آپ نے
جو بات کی خدا کی قسم پائیدار کی

کچھ شوقِ جاں ستاں دلِ خانہ خراب کا
کچھ بے نیازیاں مرے غفلت شعار کی

سو رنگ کی تصویریں حاضر بھی ہیں غائب بھی
پردہ مری آنکھوں کا فانوسِ خیالی ہے

ہنگامۂ اُلفت میں ہر چیز کو کھو آئے
اک حسرتِ محرومی مشکل سے سنبھالی ہے

ہر ساز میں اک نوحہ ہر سوز میں اک نغمہ
دُنیائے محبت کی دُنیا ہی نرالی ہے

پیوندِ زمیں ہو کر یہ راز کھُلا ہم پر
دُنیا بھی خیالی تھی عقبےٰ بھی خیالی ہے

پردہ داریِ محبت کس قدر پُرلطف تھی
دل کی بے تابی نے یہ مضمون عریاں کر دیا

دل جلوں کی آہ کا اتنا اثر کچھ کم نہیں
بجلیوں کو مضطرب شعلوں کو لرزاں کر دیا

آئینے کو بھی نہیں اس جلوۂ تاباں کی تاب
آپ نے پانی کو بھی آتش بہ داماں کر دیا

گریۂ شرمِ گنہ سے اور رُسوائی ہوئی
داغِ عصیاں میں نے دھو دھو کر نمایاں کر دیا

اک فقط میں ہی تو ناکام نہ آیا ظالم
خاک اُڑاتی ترے کوچے سے صبا بھی آئی

بجھ گیا آہ چراغِ دلِ سوزاں بھی مرا
گور میں بادِ فنا بعدِ فنا بھی آئی

پھولنا نخلِ تمنا کا مرے کیا ممکن
آہِ پُرسوز اُسے آگ لگا بھی آئی

تیغِ قاتل نے جو مقتل میں کیا قتل مجھے
جان کے ساتھ مرے لب پہ دُعا بھی آئی

کیا برباد جس نے غنچہ و گل کو خزاں بن کر
کسی مے نوش کی وہ حسرتِ جام و سبو ہوگی

مجھے یہ آرزو کھل جائے میرا غنچۂ دل بھی
انھیں یہ خوفِ رُسوائی کہ اس غنچے میں بُو ہوگی

قدم اے اژدحامِ یاس دل میں دیکھ کر رکھنا
کسی گوشے میں میری عمر بھر کی آرزو ہوگی

پلائی تھی یہ کیا ساقی کہ رسوا کر گئی مجھ کو
مئے گُل رنگ میں تحلیل میری آبرو ہوگی

کیسے کیسے ماہ پیکر ماہ رُو پیدا ہوئے
کیسی کیسی صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں

اب مجھے ناکامیوں پر بھی خجل ہونا پڑا
اب مری محرومیاں بھی داغِ عصیاں ہوگئیں

راحت و آرام کی عیش و طرب کی خواہشیں
کاہشیں بن کر بلائے جانِ انساں ہوگئیں

اے دلِ ناکام خود تُو نے مصیبت مول لی
یہ وفائیں تیری بربادی کا ساماں ہوگئیں

میری ہر کوشش کو بدبختی نے باطل کر دیا
تھا جو مشکل کام اُس کو اور مشکل کر دیا

تیرے وعدے کو جفا کاری میں تجھ پر بھی ہے فوق
اس نے جینے کی طرح مرنا بھی مشکل کر دیا

مُنہ سے بولیں سر سے کھیلیں تیرے کُشتے رات دن
تُو نے کیا جادو یہ اے شمشیرِ قاتل کر دیا

یہ سمجھتے تھے کہ موت آئے تو ہو غم سے نجات
وہ جب آئی اُس نے دم لینا بھی مشکل کر دیا

سرگزشتِ زندگی پوچھو نہ اے اہلِ عدم
ایک محشر تھا کہ زیرِ آسماں دیکھا کئے

حُسنِ مطلق ہی یہاں اک دیکھنے کی چیز ہے
وہ نہیں دیکھا تو سب کچھ رائیگاں دیکھا کئے

منزلِ دل میں نہ پایا عیش و راحت کا گزر
رنج و غم کو کارواں در کارواں دیکھا کئے

چارہ سازوں نے بھی آخر دست گیری چھوڑ دی
دیر تک نبضِ مریضِ ناتواں دیکھا کئے

تیغِ قضا کے آگے بھی آخر میں جُھک گیا
گردن کمندِ غم میں گرفتار دیکھ کر

دامن کے چاک ہوتے ہی اُبھرے ہیں دل کے داغ
چونکے ہیں یہ بھی صبح کے آثار دیکھ کر

دُنیائے عشق صیدِ زبوں ہو کے رہ گئی
دستِ نگاہِ ناز میں تلوار دیکھ کر

میدانِ ہست و بود میں ہر ذرّہ کی نگاہ
خجلت زدہ ہے مجھ کو گنہ گار دیکھ کر

عمر بھر کی یہ کمائی کہیں برباد نہ جائے
داغِ الفت کو کلیجے سے لگا رکھا ہے

سو تو لینے دے ذرا فتنۂ محشر ہم کو
ارے کم بخت یہ کیا شور مچا رکھا ہے

آؤ خلوت میں یہاں غیر کا کچھ دخل نہیں
ایک دل اُس کو بھی پہلو میں چھپا رکھا ہے

ایک ہم ہیں کہ تمھیں دل میں جگہ دیتے ہیں
ایک تم ہو کہ ہمیں دل سے بھلا رکھا ہے

نالۂ جاں گداز ہوں نغمۂ دل نواز ہوں
ساز جو ہے وہ سوز ہوں سوز جو ہے وہ ساز ہوں

جو نہ کسی پہ کھل سکا جو نہ کسی سے حل ہوا
تم بھی وہ ایک راز ہو میں بھی وہ ایک راز ہوں

فطرتِ حسن و عشق میں آ نہ سکے گا انقلاب
لاکھ وہ بے نیاز ہوں لاکھ ہیں بے نیاز ہوں

کامل کی جو پوچھو تو نہیں خضر بھی کامل
جینا اُسے آتا ہے تو مرنا نہیں آتا

اس میں بھی ہیں پیدا ستم و جور کے پہلو
تم رحم بھی کرتے ہو تو کرنا نہیں آتا

نااہل ہے وہ اہلِ سیاست کی نظر میں
وعدے سے کبھی جس کو مکرنا نہیں آتا

دل کو فرحت بخشتا ہے داغ مٹ جانے کے بعد
پھول اس گلشن کا بو دیتا ہے مرجھانے کے بعد

دور کر دیتا ہے راہِ شوق کی تاریکیاں
شمع بن جاتا ہے ہر پروانہ جل جانے کے بعد

غم جو کھاتا ہوں تو مجھ کو کھائے جاتا ہے یہ غم
کھاؤں گا پھر کیا میں دنیا بھر کا غم کھانے کے بعد

اُس حسن سے اُمید نہ رکھ مرہم دل کی
جتنی ہے ملاحت وہ نمکداں کے لئے ہے

بجلی نے کیا خاک چمن جس کا جلا کر
آندھی بھی اُسی سوختہ ساماں کے لئے ہے

اب نبض دکھانے کا وہ سودا نہیں سر میں
اب ہاتھ مرا وقفِ گریباں کے لئے ہے

کیا تجھ سے کہوں دیکھنے والے کہ تو کیا دیکھ
آنکھیں ہیں تو مظلومی اربابِ وفا دیکھ

آئینے میں جلوہ تو بہت دیکھ چکا تو　　اک خاک بداماں کی مصیبت بھی ذرا دیکھ
اے دل ترا نالہ بھی کہیں جرم نہ بن جائے　　خاموش ہو کم بخت زمانے کی ہوا دیکھ

دل پہ وہ تیرے ستم تیری جفا تیرا غضب　　عمر بھر یاد رہا یاد رہی یاد رہے
مجھ کو اتنا بھی نہ برباد کر اے برقِ بلا　　گلشن اُجڑا تو قفس ہی مرا آباد رہے
جور میں بھی ہے نمایاں تری عظمت ہی کی شان　　جن کو برباد کیا تو نے وہ برباد رہے

مختصر بھی ہے اور جامع بھی　　کیا ہوا کا جواب کیا نہ ہوا
جور میں بھی وہی ہے اوچھا پن　　اس ادا کا بھی حق ادا نہ ہوا
ہاں کہو کچھ ہمیں بھی ہو معلوم　　وہ گلا کیا جو برملا نہ ہوا

معما بن گئی تحریر پاسِ رازداری سے　　وہ اتنا بھی نہ سمجھے یہ کہانی کون کہتا ہے
اگر تم وہ نہیں تو کیا ہمارے کان بجتے ہیں　　پسِ پردہ یہ چھپ چھپ کر لن ترانی کون کہتا ہے
مجھی کو بے نشاں کرنا ہے اس تحریر کا مقصد　　ترے خط کو محبت کی نشانی کون کہتا ہے

یا حسنِ خود نما کہیں رکھئے حجاب میں　　یا گرمیِ نگہ کا گلا چھوڑ دیجیے

اب سلسلہ چھڑا تو گلے دل میں کیوں رہیں
کہ جلیئے حجاب ذرا چھوڑ دیجیۓ

اس بحث میں گزار دی ہم نے تمام عُمر
بُت چھوڑ دیجیۓ کہ خدا چھوڑ دیجیۓ

جس کی اُلفت میں ہم ہوئے برباد
وہی بیگانۂ وفا نِکلا

غم کی تلخی تو پھر بھی تلخی تھی
عیش کا پھل بھی بے مزا نِکلا

اُس کے لُطف و کرم کا کیا کہنا
تیر بھی جس کا دل رُبا نِکلا

نگاہ قہر سے وہ دیکھتے ہیں
الٰہی آج میں کیا دیکھتا ہوں

گلستاں میں بہار آئی ہے شاید
خِرد کو سر بہ صحرا دیکھتا ہوں

ڈبو دے گا مرا ذوقِ نظر کیا
ہر اک قطرے میں دریا دیکھتا ہوں

سَو بار اگر سر مری گردن سے جُدا ہو
تھوڑا سا بھی حق تیغِ ادا کا نہ ادا ہو

یہ کیا ہے کہ تھم تھم کے کسک ہوتی ہے دل میں
تم نے نہ کہیں دستِ ستم روک لیا ہو

ناکامِ تمنا ہوں میں اُس اشک کے مانند
مرتے ہوئے بے کس کی جو آنکھوں میں رُکا ہو

ہائے لایا بھی تو کیا لایا مرے خط کا جواب
بال و پر نُچوا کے آ بیٹھا کبوتر سامنے

نزع کے عالم میں بھی دیکھیں عجب نیرنگیاں ایک منظر ہے پسِ پشت ایک منظر سامنے
بخت برگشتہ فلک دشمن زمانہ برخلاف ان حسینوں کے کروں کس حوصلے پر سامنے

دہر میں جنسِ وفا کا کوئی گاہک نہ ملا ہمیں گھاٹے میں رہے مول یہ جھگڑا لے کر
اے اجل تیرے گرائے سے اگر گر بھی گئے دوشِ احباب کا اُٹھیں گے سہارا لے کر
شکرِ نعمت کی کوئی قسط ادا ہو نہ سکی یہ وہ ہے قرض کسی نے نہ اُتارا لے کر

کوئی دم اے غنچۂ نشگفتہ ہنس لے بول لے تو کدھر کو جا رہا ہے بوریا باندھے ہوئے
کھل گئی اب اے دلِ بے تاب قسمت کھل گئی آگیا وہ ترکِ شمشیرِ جفا باندھے ہوئے
حالِ غم ہائے کشودِ کار اے ہمدم نہ پوچھ مدتیں گزری ہیں نالوں کو رسا باندھے ہوئے

میرے نغمے سن کے مے خانے کی ہر مورت ہے مست پھول برساتے ہیں مجھ پر سیکڑوں پتھر کے ہاتھ
گھر کی دربانی اگر سونپی تو کچھ شکوہ نہ تھا تم نے میری آبرو بھی سونپ دی نوکر کے ہاتھ
تیغِ قاتل کی ثنا میں دم نہیں لیتے ہو جوش بک گئے جوہر تمھارے صاحبِ جوہر کے ہاتھ

بعدِ فنا بھی اپنا رنگِ بقا وہی ہے ہم پھول ہیں الٰہی کس باغِ بے خزاں کے

فریاد خوانیوں سے یہ آبرو ملی ہے — مثلِ جرس ہمیشہ آگے ہوں کارواں کے
صیاد نے یہ کی ہے اچھی ستم ظریفی — باندھا مرے قفس کو پہلو میں آشیاں کے

کمر بارِ غم سے دوتا ہو گئی — نمازِ محبت ادا ہو گئی
وفا پر جو مرتی رہی عمر بھر — الٰہی وہ مخلوق کیا ہو گئی
وہ پاسِ ادب تھا دمِ عرضِ حال — شکایت بھی لبِ دعا ہو گئی

عصیاں کا خیال کیجیے گا — کچھ فکرِ مآل کیجیے گا
ممکن نے تو مشکلوں میں ڈالا — اب شوقِ محال کیجیے گا
اے حضرتِ دل یہ خواب کب تک — عقبیٰ کا خیال کیجیے گا

دور جا پہنچا غبارِ کارواں — میری مشتِ خاک تنہا رہ گئی
نغمۂ عشرت گیا عشرت کے ساتھ — اک صدائے وا دریغا رہ گئی
سب تمنائیں ہماری مر چکیں — ایک مرنے کی تمنا رہ گئی

ہر مرگ و زندگی میں یہ فرق ہے نمایاں — وہ ایک مدعی ہے یہ ایک مدعا ہے

حُسن اور مہربانی عشق اور شادمانی
ایسا کبھی نہ ہوگا ایسا کبھی ہوا ہے
کھوئے گئے ہم ایسے یہ آج تک نہ سمجھے
موجود ہے تو کیا ہے نابود ہے تو کیا ہے

پانی ترے خنجر کا اگر تا کمر آئے
دریائے محبت کا کنارا نظر آئے
ہاروت کو جن سحر فنوں سے حذر آئے
وہ زہرہ جبیں دل میں ہمارے اُتر آئے
ہو جائے مرے دل کی کلی دم میں شگفتہ
تُو باغ میں بن کر جو نسیمِ سحر آئے

ہے نالہ ہائے غم میں نہاں نغمہ عید کا
ہر اشکِ خوں ستارہ ہے صبحِ اُمید کا
کانوں کو بند کرکے زباں کو دہن میں تھام
کچھ لُطف دیکھنا ہو جو گفت و شنید کا
چشمک بھی برق کی کہ تجلّیِ حُسنِ یار
ارمان رہ گیا مری آنکھوں کو دید کا

وہ داغ ہوں جو کبھی شُست و شو سے جا نہ سکے
وہ نقش ہوں کہ زمانہ جسے مٹا نہ سکے
جمالِ دوست نے بے خود بنا دیا ایسا
سرِ نیاز بھی محفل میں ہم جھکا نہ سکے

حسینانِ کافری اِک اِک ادا میں
خدائی کے جلوے نظر آ رہے ہیں

عجب مردہ دل ہیں عدم کے مسافر — بھری محفلیں چھوڑ کر جا رہے ہیں

اب اس شکوے سے کیا حاصل کہ رہ بر خود غرض نکلا — پرائی آس جو تکتے ہیں اکثر خوار ہوتے ہیں

اسی رحمت کے دریا میں الٰہی غرق کر ہم کو — کہ جس رحمت سے ملّاحوں کے بیڑے پار ہوتے ہیں

قسمت ہی کم بخت نہ جاگی سب کچھ کر کے دیکھ لیا

فریادیں بھی کام نہ آئیں نالے بھی بے کار گئے

ترکِ وفا کے بدعہدی کے مجرم ہم ہیں یوں ہی سہی

ختم کرو اس بحث کو صاحب تم جیتے ہم ہار گئے

حُسن کو جور سے بے گانہ بنایا ہوتا — اتنا خونیں نہ یہ افسانہ بنایا ہوتا

تُو نے دنیا کو تو بے گانہ بنایا مجھ سے — مجھ کو دُنیا ہی سے بے گانہ بنایا ہوتا

جلوۂ رُخ دکھا کہیں دل کی خلش مٹا کہیں — نیند ہی بن کے آ کہیں دیدۂ انتظار میں

لالۂ صحنِ باغ ہوں گو ہرِ شب چراغ ہوں — پھر بھی میں ایک داغ ہوں دامنِ روزگار میں

ہر وقت ستم ڈھانا ہر وقت جفا کرنا　　معلوم نہیں ان کو منظور ہے کیا کرنا
باقی مرے قصے کی اب وہ ہی یہ باتیں ہیں　　جینے کی دعا دینا مرنے کی دعا کرنا

ہوا ہے بے کسی کا اب یہ عالم رنجِ فرقت میں　　کسی کی یاد بھی پہلو سے رخصت ہونے والی ہے
چبھوں گا اب میں کانٹا بن کے آپ اپنی نگاہوں میں　　تمنا میرے دل کی خارِ حسرت ہونے والی ہے

پیامِ شوق کی ہے دم بہ دم یہی تاکید　　ذرا کچھ اور بھی قاصد قدم بڑھائے ہوئے
یہ سوچتا ہوں کہ مانگے سے آبرو نہ ہو کم　　درِ کریم پہ بیٹھا ہوں سر جھکائے ہوئے

اب مٹتی جا رہی ہیں اُمنگیں شباب کی　　ہر سانس دے رہی ہے خبر انقلاب کی
کھُلتا ہے اس سے رازِ فریبِ حیات کا　　جامِ جہاں نما ہے پیالی حباب کی

بے گناہوں پہ اُٹھاؤ نہ ستم کی تلوار　　اِدھر آؤ کہ خطاوار تمہارا میں ہوں
نفع پایا نہ کوئی طبعِ رواں سے اے جوشؔ　　ایک گوہر بھی نہیں جس میں وہ دریا میں ہوں

اے موت تیرے عدل کے قربان جائیے　　مفلس کو پادشہ کے برابر بنا دیا

کچھ خاک تھی جو قالبِ انساں میں صرف کی
کچھ برق تھی جسے دلِ مضطر بنا دیا

تیرے فیضِ حُسن کے ہیں یہ کرشمے جا بجا
باغ میں گُل ابر میں بجلی فلک پر آفتاب
ہم سری کیا کر سکے آوارگانِ عشق سے
اپنے برجوں سے کبھی نکلا نہ باہر آفتاب

اور کیا فریاد و فریادی کریں
نیم جانی خود لبِ فریاد ہے
کیا گلہ حُسنِ ستم ایجاد کا
عشق خود بھی تو ستم ایجاد ہے

صاف کہتی ہے ستم گر سے زبانِ شمشیر
رنگ لائیں گی جفائیں تری یہ یاد رہے
بے گناہوں پہ جو گزری وہ سُناؤں میں اگر
حشر تک ایک زمانہ لبِ فریاد رہے

کوئی دم تو چین دے تسکین دے آرام دے
اِس قدر رکا دے نہ تو اے گردشِ ایّام دے
رُک کے چلتی ہے صبا میرے قفس کے رُوبرو
اس توقع پر کہ شاید یہ کوئی پیغام دے

دل آزاری ہے اگر خوُ تمھاری
شکایت کی شکایت اس قدر کیوں

یہ اپنی بے رُخی سے پُوچھے گا ادھر کی ہو گئی دُنیا اُدھر کیوں

رُلا دے گی یہ ہر سنگِ گراں کو ہنسی سمجھیں نہ وہ دل کی فغاں کو
مرا گھر ہے بُرا ہے یا بھلا ہے لگا دوں آگ کیوں کر آشیاں کو

ہاتھ پھیلائے ہیں دعا کے لئے بدگماں کو گمان اور ہی ہے
تاجِ شاہی کے چاہنے والو خاک ساری کی شان اور ہی ہے

شرم رکھ لی حشر میں میرے گناہوں نے مری ظلمتِ عصیاں نے ہر پہلو میں پردا کر دیا
عیش میں ڈوبے ہوئے دل کا ٹھکانا ہے کہاں یہ بھی حکمت تھی کہ ناکام تمنا کر دیا

رہا نہ جب کوئی زنجیر نالۂ بُلبُل چلا ہے سوئے فلک تیر نالۂ بُلبُل
چمن سے دشت کو جائیں تو کس طرح جائیں پڑی ہے پاؤں میں زنجیر نالۂ بُلبُل

قاتل ہے یہ بہارِ گلستانِ رنگ و بُو سمجھا رہا ہے لالۂ خونیں کفن مجھے

کیوں کر ہو ضبطِ راز کہ اکثر بنا دیا　　میری خموشیوں نے سراپا دہن مجھے

اللہ اللہ ترے جلووں کا ہمہ گیر اثر　　جس نے کچھ ہوش سنبھالا وہی دیوانہ ہُوا
عرضِ مطلب پہ وہ گھبرا کے یہ فرماتے ہیں　　چار حرفوں کا یہ شکوہ تھا جو افسانہ ہُوا

حیف اے اُلفتِ فریب انجام　　ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے
آپ بے وجہ مدعی کیوں ہیں　　آپ کا اس سے مدعا کیا ہے

ہر وقت کی ناشادی فطرت تو نہیں دل کی　　تم شاد نہیں کرتے یہ شاد نہیں ہوتا
تحریر میں اس کو بھی زنجیر سے نسبت ہے　　نالہ بھی اسیروں کا آزاد نہیں ہوتا

ترا عہدِ وفا عہدِ وفا ہرگز نہیں ظالم　　کسی مے کش کی توبہ ہے کسی کافر کا ایماں ہے
خزاں کا خوف بجلی کا خطر صیاد کا کھٹکا　　گلستاں میں دھرا کیا ہے گلستاں ہی گلستاں ہے

انتہائے یاس نے بخشا سکونِ دل مجھے　　بحرِ غم میں تہ نشیں ہو کر ملا ساحل مجھے

رہ نما کی رہ نمائی تو بھٹک کر رہ گئی　　شوق صادق ہی نے پہنچایا سرِ منزل مجھے

نمرود کی تربت سے یہ آتی ہیں صدائیں　　آئے گا بڑا بول ستم گار کے آگے
مجھ ذرّۂ بے جاں کی تو ہستی ہی نہیں کچھ　　بے دم ہے مسیحا تری تلوار کے آگے

میں ہوں وہ سیر چشم کہ پیتا نہیں کبھی　　جب تک نہ مجھ کو جام چھلکتا ہوا ملے
مِلنا تو ہے وہی کہ رہے عمر بھر ملاپ　　دم بھر کے واسطے وہ ملے بھی تو کیا ملے

آہِ سرد و چشمِ گریاں سے ہے پیدا برشگال　　وہ ہوا برسات کی ہے یہ گھٹا برسات کی
آج تو ساقی عنایت کر مجھے دو چار جام　　سال بھر کے بعد آئی ہے گھٹا برسات کی

کس کو مِلا ہے بار تری بارگاہ میں　　عمریں گزر گئی ہیں محبّت کی راہ میں
کر دیں تمھیں بھی خوار نہ اس کی شرارتیں　　اپنی نگاہِ شوخ کو رکھّو نگاہ میں

زہد و طاعت کا ہوں دل دادہ نہ زاہد کا مُرید　　اُس کا بندہ ہوں جو مالک ہے گنہ گاروں کا

جو ترے کوچے میں آیا وہ ہوا سودائی
ایک آسیب ہے سایہ تری دیواروں کا

صورت بتوں کی حق نے بنا کر یہ کیا کیا
پہلو میں رکھ دیا کوئی پتھر بجائے دل

کنج قفس میں دل کے ہے دم پر بنی ہوئی
صیاد زمزمے تجھے کیوں کر سنائے دل

کیا ہجر نے اس قدر ناتواں
تصور بھی کوہ گراں ہو گیا

شب ہجر کیوں ختم ہوتی نہیں
یہ بے مہر کیا آسماں ہو گیا

جتنا تھا سوز ہو گیا نالوں میں میرے جذب
اک شور سا فغانِ عنادل میں رہ گیا

حسرت نصیب وہ ہے جو ہو کر شکستہ پا
منزل سے دور حسرتِ منزل میں رہ گیا

یہ قفس یہ جال یہ پھندے تھے سب میرے لئے
بن گئے معصوم وہ میری گرفتاری کے بعد

رنج و غم سے زندگی جی کا زیاں ثابت ہوئی
جنس کھوٹی تھی مگر دیکھی خریداری کے بعد

متفرّق اشعار

سرگزشتِ اہلِ محفل ہے بہت ناگفتنی
شمع کو معلوم ہے سب کچھ مگر خاموش ہے

کون جانے کون سمجھے چاکِ دامانی کا راز
تم ہیں اے اہلِ بصیرت کوئی دیوانہ بھی ہے

کیوں ستاتی ہے عبث حسرتِ دیدار مجھے
پردۂ چشمِ تمنّا بھی ہے دیوار مجھے

تمھاری بات پہ کچھ رنج یا ملال آئے
یہ خواب میں بھی نہ ہم کو کبھی خیال آئے

کئی دن سے تمھارا ہے سلوک اے دوست رُوکھا سا
نہ وہ تکریم اگلی سی نہ وہ برتاوُ پہلا سا

کیا انوکھے تری محفل میں ستم ہوتے ہیں
نامہ لکھنے پہ مرے ہاتھ قلم ہوتے ہیں

باغ میں چھیڑو نہ میرا قصۂ دردِ فراق
رنگِ گُل سے نغمۂ بلبل سے جدا ہو جائے گا

سُنتا ہوں رات بھر وہ رہے پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اُنھیں کیا اضطراب میں

دل ڈوب بھی جائے گا تو چارا نہ کریں گے
دریائے محبّت سے کنارا نہ کریں گے

غریبوں پہ کیوں زہر اُگلتے ہو ناحق
گنہ ہے یہ وہ جس میں لذّت نہیں ہے

دیکھنا رنگینیٔ نظارۂ ذوقِ خلش
خارِ صحرا کو بھی میں نے گُل بہ دامن کر دیا

آگئی جب جان لب پر طے مسافت ہو گئی
لب ہمارا بحرِ ہستی کا کنارا ہو گیا

صحبتِ ساقی بھی ہو ساغر بھی ہو صہبا بھی ہو
چار دن کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی ہو

ایک تو یہ نازکی پھر اس پہ اتنا بارِ حسن
آپ بھی میری طرح شکوہ کریں تقدیر کا

ترے انداز پر عمرِ رواں کچھ شک گزرتا ہے
لئے جاتی ہے تو مجھ کو کدھر آہستہ آہستہ

ہوا ہوں سوزِ غم سے ناتواں اتنا کہ نالے بھی
چراغِ کشتۂ گورِ غریباں ہوتے جاتے ہیں

مرے دل کی تڑپ نے جان تک چھوڑی نہ قالب میں
بجھا ڈالا چراغِ عمر اس پنکھے نے ہل ہل کر

وہ لطف ہی نہیں اب وہ بات ہی نہیں اب
یا میں بدل گیا ہوں یا تم بدل گئے ہو

کر گئی زندۂ جاوید محبت ہم کو
کس کی ہستی کو مٹائیں گے مٹانے والے

مجھ کو محوِ جلوۂ دیدار رہنے دیجئے
دل اگر دو ہیں تو آنکھیں چار رہنے دیجئے

بے پر ہے عندلیبِ سخن مدتوں سے جوش
ہم کو اڑائے پھرتی ہوا واہ وا کی ہے

سمجھا ہے بزرگوں کی بزرگی کو بزرگی
کچھ آرزوئے کسبِ کمالات نہیں اب

رات کو دفترِ گناہوں کے جو یاد آنے لگے
اشک آنکھوں سے نکل کر مجھ کو سمجھانے لگے

ٹھہریں نہ بجلیاں مرے داغوں کے سامنے
جگنو چمک سکے نہ چراغوں کے سامنے

جی میں ہے غم گسار انھیں فرض کیجئے
طولِ شبِ فراق بھی کچھ عرض کیجئے

بے خودی طاری ہوئی مجھ پر تمھاری یاد میں
تم نے مجھ کو بھی مری نظروں سے پنہاں کر دیا

جنبشِ لب نے زمیں سے جو اُٹھایا مجھ کو
قُم باذنی کا تماشا نظر آیا مجھ کو

تصوّر کیا مسرّت خیز ہے اُس آفتِ جاں کا
نہ کچھ خدشہ ہے دشمن کا نہ کچھ کھٹکا ہے درباں کا

نہ مسیحا ہی اب آتا ہے نہ موت آتی ہے
ہائے یہ روگ محبّت کا بُرا ہوتا ہے

وادیِ وحشت میں جو گزری نہ مجھ سے پُوچھئے
خارِ صحرا کو مرا سارا فسانہ یاد ہے

اور کیا میں ہوں اگر تو نہیں میرا محبوب
اور کیا تو ہے اگر میں نہیں شیدا تیرا

زندہ دلی

اُن کو شوقِ تن تناتن تن تنات
مجھ کو ذوقِ فاعلاتن فاعلات

بنگلہ ہی نہیں گور بھی انساں کے لئے ہے
یہ مٹیا محل بھی اسی مہماں کے لئے ہے

پرتگالی کا میں دل دادہ نہیں اے ساقی
انڈ اینڈ اگر ہے تو بتا کون سی ہے

دل لے کے کہتے ہیں کہ نوشت اس کی دیجئے
ایسا نہ ہو کہ بعد میں جھگڑا کرے کوئی

کمیٹی کی پرچی سلامت رہے
غریبوں کا یہ آسرا ہو گئی

تپش دل میں ہے آہ سرد کے ساتھ
مہینا جون کا ہے جنوری میں

حسینوں کی طرف تو بیٹھ ہو گی
دھرا کیا ہے فلاں کی نوکری میں

روز کے ملنے میں یہ ڈر ہے انھیں
دل بری نوکری نہ ہو جائے

شعر خوانی ہم نوائے چنگ ہے
داد لینے کا یہ اچھا ڈھنگ ہے

اہلِ مغرب کے قریب آبادیں
صلح کا چرچا پیامِ جنگ ہے

آپ گورے ہیں تو ہم کالے سہی
عیب کیا ہے اپنا اپنا رنگ ہے

سانس لینے میں بھی دشواری ہوئی
کس قدر طوقِ غلامی تنگ ہے

راہِ عدم میں چور ہی اتنا کرم کرے
چپکے سے لے اُڑے مری گٹھڑی گناہ کی

چار عنصر تو بنائے تھے مگر اے خالق
چار عنصر کا یہ پتلا نہ بنایا ہوتا

وہ اگر کچھ مُسکرایا بھی تو یہ کیوں ہنس دیا / طفلِ غنچہ سے زیادہ ہے لڑکپن پھُول میں

لب پہ توبہ ہاتھ میں جامِ شراب / رندیِ اربابِ تقویٰ دیکھیے

اے کاش اُس کو مجھ کو باہم گلے مِلا دیں / دو آدمی یہاں کے دو آدمی وہاں کے

تقریر جاہلوں میں اثر خیز چاہیئے / نخچیر سخت جاں ہے چھُری تیز چاہیئے

غیر کی تصویر پر کہتے نہیں اشعار ہم / بے زباں پر کیا کریں تیغِ زباں کا وار ہم

نام لکھ آئے تھے اپنا باغ کے ہر پھُول میں / یوں ہوئے اے باغباں اُن کے گلے کا ہار ہم

بازی کہیں مات ہی نہ ہو جائے / ایسی تو نہ چال کیجیئے گا

مُردے کو ضرور کیا ہے تابوت / کیا لے کے یہ پالکی جیئے گا

ممکن نے تو مشکلوں میں ڈالا / اب شوقِ محال کیجیئے گا

نوٹ پر یہ نوٹ کر دو جوش تم / دولت اب کاغذ کا ٹکڑا رہ گئی

فرنگی کا گلہ ہر بات پر کیوں / طویلے کی بلا بندر کے سر کیوں

یقیں اے دل نہ کر تو حضرتِ واعظ کی باتوں کا / یہ لمبی ڈاڑھیوں والے بڑے عیّار ہوتے ہیں

بڑھیں عاشقوں کی وہ ارزانیاں / محبّت کا سودا گراں ہو گیا

لُطف جب ہے کہ ہم ابر کا ہو پینے والا / کوری مٹّی کے پیالے میں پلا دے ساقی

پہلی ہی ضربِ آہ سے چکرا گیا فلک / سچ ہے کہ سو سُنار کی اور اک لہار کی

اے شیخ گو نہیں ہیں کوئی ذی شعور ہم — اتنا تو جانتے ہیں کہ تم بے شعور ہو

عدل یہ تھا حُسن والوں سے بھی ہوتی باز پُرس — کیوں فرشتوں کو اسیرِ چاہِ بابل کر دیا

وہ مدح کی کہ سُنتے ہی قاصد ہوا ہُوا — ہم نے اڑا اڑا کے کبوتر بنا دیا

وہ شست باندھ کے کہتے ہیں لیجئے حضرت — یہ تیر آپ کلیجے کے پار دیکھیں گے

جو اور مدعا ہو وہ کہیئے جناب شیخ — یہ چھوڑ دیجئے کی صدا چھوڑ دیجئے

محشر میں سُن رہا ہوں صدا واہ واہ کی — یا رب ملی یہ داد مجھے کس گناہ کی

دوبارا وہی بات کیوں پوچھتے ہو — اگر تم کو ثقلِ سماعت نہیں ہے

شاعر ہے وہی جس نے گلا پایا ہے — یا شعر "گلے باز" سے پڑھوایا ہے

اے جوش زمانہ شعر کہنے کا نہیں — اب شعر الاپنے کا دور آیا ہے

اپنائے ہیں عورتوں نے مردوں کے نشاں — مردوں پہ بھی عورتوں کا ہوتا ہے گماں

آیا کس کو کہیں گے آپی کس کو — کچھ اس کا جواب دیں مجھے اہلِ زباں

بھلا سا اب وہ حُسنِ "تکلم" نہیں رہا — ہر روز بھانت کی سُنتے ہیں بولیاں

عُریاں کیا ہے شاہدِ مضموں کے جسم کو — مسکی ہوئی ہیں آج حسینوں کی چولیاں

اے وائے شاعری کہ تخلص مسیح ہے — لیکن جو شعر ہیں وہ مریضوں کی ڈولیاں

اسیرِ حرص نہ کیوں ہو حریصِ طولِ امل — وہ چاہتا ہے کہ رسّی ذرا دراز رہے

چند قطعاتِ تاریخ

(۱)

جمہوریت قائم ہونے کی تقریب پر

۲۶ر فروری سنہ ۱۹۵۰ء کو بہ مقام دہلی لال قلعہ کے مشاعرہ میں پڑھا گیا

محکومیت سے مل گئی آخر ہمیں نجات
آیا تھا سب کے سر پہ جو طوفاں گزر گیا

دل میں اُتر گیا تھا جو حسنِ نظر فریب
کیا انقلاب ہے کہ وہ دل سے اُتر گیا

شکوہ جفائے غیر کا کب تک کریں گے ہم
سچ تو یہ ہے کہ اس سے بھی جی سب کا بھر گیا

افسردگی کے دور کو اب بھول جائیے
جھونکا خزاں کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

نغمے خوشی کے آج ہیں سب کی زبان پر
آہ و فغاں کا شور نہ جانے کدھر گیا

حُبِّ وطن کے جذبے کو دل میں نہ ڈھونڈیئے
مدت ہوئی کہ وہ رگِ جاں میں اُتر گیا

اب ہم ہیں اور ابرِ کرم کی نوازشیں
برسا وہ نور جس سے گلستاں نکھر گیا

یہ سالِ عیسوی بھی بہت برمحل ہے جوشؔ
اہلِ وطن کا طوقِ غلامی اُتر گیا

۱۹۵۰ء

(۲)

قطعۂ تاریخ وفاتِ حضرتِ داغ دہلوی

حیف وہ معجز رقم معجز بیاں بھی اُٹھ گیا
چار جانب سے سُنی جس نے صدائے آفریں

آشیاں میں اب نہیں وہ عندلیبِ خوش نوا
جس کا ہر نغمہ تھا دل کش ہر ترانہ دل نشیں

پایۂ حُسنِ سخن جس کا تھا ہم دوشِ فلک
آج ہے وہ آسمانِ شاعری زیرِ زمیں

اُس کے نغموں سے بھی نالوں کی صدا آتی ہے آج
جس کے نالوں پر بھی تھا نغماتِ شیریں کا یقیں

لاکھ ڈھونڈے اُس کو گُل زارِ تکلّم میں کوئی
داغ کا رنگِ تغزّل بِل نہیں سکتا کہیں

رفعتِ مضموں سے معراجِ سخن تھی ہر غزل
ہر غزل میں قافیہ تھا قاف کا پہلو نشیں

رنجشوں کے ذکر میں بھی سو شکر گفتاریاں
تلخیِ غم کے مضامیں بھی سراسر انگبیں

ہر بیاں میں جدّتیں تھیں جدّتوں میں شوخیاں
شوخیاں بھی وہ کہ جُھک جائے مُتانت کی جبیں

بزم میں بے سُود ہے اب اوّل و آخر کی بحث
دورِ آخر میں وہی تھا افتخارِ اوّلیں

محفلِ غم میں سُنا وہ جوشؔ یہ سالِ رحیل
بُلبُلِ ہندوستاں آج اپنے گلشن میں نہیں

۲۲ ۱۳ ھ

(۳)

قطعۂ تاریخ طبع دیوان جناب مہر گوالیاری

شاگرد جناب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی

حضرتِ مہر نے دیوان مرتّب کر کے
مشرقِ شعر میں تنویر دکھائی کیا کیا

بزم ہے سوزِ محبت کے بیاں سے مسحور
پردۂ ساز میں کی نغمہ سرائی کیا کیا

کوئی دیکھے تو بہارِ چمنستانِ سخن
گلِ صد رنگ کی ہے جلوہ نمائی کیا کیا

لعل و یاقوت سے بہتر ہیں مضامینِ غزل
ڈھونڈ لائی ہے طبیعت کی رسائی کیا کیا

جوش یہ مصرعِ تاریخ سُنا دو تم بھی
حُسنِ معنی کی تجلّی نظر آئی کیا کیا
۱۹۹۴ بکرمی

---

(۴)

قطعۂ تاریخ وفات ٹیگور

بزمِ سخن میں کیوں نہ ہو ذوقِ سماعت نوحہ گر
موجود محفل میں نہیں جادو بیاں ٹیگور حیف

تاریخ رحلت کے لئے اے جوش یہ مصرع کہو
آج اُٹھ گیا ہے شاعرِ معجز زباں ٹیگور حیف
۱۹۴۱ء

(۵)

قطعۂ تاریخ وفات جناب احسن مارہروی شاگرد حضرت داغ مرحوم

مرگِ احسن کی دل خراش خبر — جس نے سُن لی وہ ہوگیا بے چین
آہ کیسی چلی یہ بادِ خزاں — ہر گلستاں میں ہے صبا بے چین
سرد آہیں ہیں گرم نالے ہیں — ہوئے مُرغانِ خوش نوا بے چین
شاعری پیکرِ ملال ہے آج — شعر بے تاب قافیہ بے چین
یہ وہ درد آشنا تھے جن کا بیاں — اک زمانے کو کرگیا بے چین
اثرِ گرمیِ سخن سے رہی — حُسنِ معنی کی ہر ادا بے چین
شعر میں لفظ ہِل نہیں سکتا — چُست بندش سے ہوگیا بے چین
اپنی وسعت سے اُن کا ہر مضمون — قفسِ شعر میں رہا بے چین
اُن کے ہر اک بیان میں دیکھا — شامِ فرقت کا ماجرا بے چین
اُن کے ہر ایک شعر میں پایا — عشق و اُلفت کا مدعا بے چین
انتہا یہ کہ صبر کا مضمون — نظر آیا ہمیں بڑا بے چین
گوشِ معنی شنو کی فرقت میں — سازِ اُلفت کی ہے صدا بے چین
سالِ ہجری رقم کرو اے جوشؔ — غمِ احسن نے دل کیا بے چین

۵۹ ۱۳ ھ

قندِ پارسی

اے خوشا وقتے کہ یادِ آں رُخِ انور کنم
کیفِ خود را بے نیازِ شیشہ و ساغر کنم

در خرابی ہا نہ گنجد فطرتِ آزادِ من
تا بہ کے خود را اسیرِ خانۂ بے در کنم

اعتبارِ من بہ ایں عصیاں شعاری در نگر
رحمتش ارزاں شود وقتے کہ دامن تر کنم

پائے رفتن ہم نمی دارم بہ بازی گاہِ عشق
من کہ ہر نردِ بساطِ دہر را ششدر کنم

فقر و درویشی مرا شانِ شہی بخشیدہ است
رختِ سلطانی بہ زیرِ خرقۂ در بر کنم

معنئے دارد در اشک آمیزشِ خونِ جگر
گریہ را بہرِ تماشائے تو خوش منظر کنم

اضطرابم را ببیں در ہر شکستِ عہدِ خود
سادگی را بیں کہ عہدِ تو دگر باور کنم

جستجوئے رہ برے لے جوش می دارم ہنوز
ہر یکے گوید کہ خضرم من کرا رہ بر کنم

قطعات

دل بہ ہر ساعت جہانے دیگر است
ہر زماں ایں را نشانے دیگر است

در بلندی پست و در پستی بلند
ایں زمیں را آسمانے دیگر است

غم خموشی را بیانے دادہ است   بے زبانی را زبانے دادہ است
منتے دارد بہ من در عرضِ حال   ناتوانے را توانے دادہ است

اے کہ داری گفتگوئے خویشتن   ہر زماں بینی بہ سوئے خویشتن
راست می گویم کہ تو گم گشتہ   در جہاں کن جستجوئے خویشتن

اے کہ در کبر و رعونت زیستی   ہر کرا دیدی بگفتی کیستی
یک جہاں را ہیچ دانستی مگر   این نہ دانستی کہ تو خود چیستی

دیگر

الا اے طالبِ لطفِ الٰہی   منہ پائے خودت را در مناہی
مکن آلودۂ عصیاں عمل را   کہ دارد معصیت سر در تباہی

بہ ہر جا بہرِ نظارہ رسیدی   ز ہر شاخے گلِ امید چیدی
چہ سودت زیں ہمہ آوارگیہا   اگر در باغِ دل چیزے نہ دیدی

گرفتم گنجِ گوہر را گرفتی! گرفتم ہفت کشور را گرفتی
حدیثِ دردِ پنہاں ہم بیاں کُن چرا دل را چرا سر را گرفتی

مکن ترکِ علائق بہرِ عقبیٰ مرو از خانۂ خود سوئے صحرا
کفیلِ خُلد باشد خدمتِ خلق عقیل است آں کہ نگریزد ز دُنیا

بہ بیں اے بے بصر دستِ تہی را فراہم کن متاعِ خوش دلی را
دلت از زندگی گر بہرہ ور نیست مکن پامال راہِ زندگی را

زہے رندی کہ تقویٰ در ثنایش زہے تقویٰ کہ رندی ہمراہیش
کسے گو زیں شرف گردد مشرف بُوَد در خاطرِ جمہور جایش

دیگر در سیاست

سیاست خدمتِ جمہور باشد ز تفریقِ خلائق دُور باشد
نمے دارند اگر ایں رازِ وحدت فقط شورِ انا المنصور باشد

بیا اے مژدۂ آزادیِ ما | بیا اے باعثِ آبادیِ ما
سرآمد یک زماں در انتظارت | بہ بیں حالِ دلِ فریادیِ ما

غلامی دشمنِ تاب و توانست | ز جورش ہر زماں محوِ فغانست
خریدارش مشوا اے تاجرِ دل | کہ ایں سودا سراسر پُر زیانست

غلامی شامتِ اعمال باشد | ازو قومے پریشاں حال باشد
پسند و آں کہ ایں افتادگی را | بہ راہِ زندگی پامال باشد

رُباعیّات

آرام کو پابستۂ آلام نہ کر
راحت کو اسیرِ ہوسِ خام نہ کر
ہر سمت سے اُنگلیاں اُٹھیں گی مجھ پہ
اے نام کی خواہش مجھے بدنام نہ کر

مشکل کا یہ اصرار کہ اب کام نہ کر
مقصد کی یہ تاکید کہ آرام نہ کر
اُٹھ باندھ لے ہمّت کی کمر اے ناداں
آغاز کو شرمندۂ انجام نہ کر

ہر غنچے نے ہر پھول نے کھِلنا سیکھا
ہر زخم نے ہر چاک نے سِلنا سیکھا
ہم کو بھی ضرورت تھی کہ مِلنا سیکھیں
لیکن ہم نے فقط نہ مِلنا سیکھا

ہر ایک کے دل میں کبرِ ہستی دیکھا
ہر ایک کے دل میں شورِ مستی دیکھا
پائی نہ کہیں خدا پرستی ہم نے
ہر چیز میں رنگِ خود پرستی دیکھا

وہ حرف ہوں ابجد میں جو مرقوم نہیں
وہ لفظ ہوں جس کا کوئی مفہوم نہیں
کیوں لائے ہیں محفلِ سخن میں مجھ کو
افسوس کہ یہ بھی مجھے معلوم نہیں

قبضے میں کلیدِ گنجِ قاروں نہ سہی
تاجِ سرِ کاؤس و فریدوں نہ سہی
اے بحرِ کرم کچھ تو عطا کر مجھ کو
قطرہ ہی سہی فرات و جیحوں نہ سہی

مفلسی

دُنیا میں جسے کسبِ کمال آتا ہے
دولت ہی سے قدر و منزلت پاتا ہے
زردار کے عیب میں بھی ہے حُسنِ قبول
بے زر کا ہنر بھی عیب ہو جاتا ہے

تقدیر جب آبِ زر سے مُنہ دھوتی ہے
آلودہ وہ گردِ غم سے کب ہوتی ہے
زردار کے گھر میں رنج و غم ہنستے ہیں
نادار کی دُنیا میں خوشی روتی ہے

فیشن

ہر ایک جواں پیر نظر آتا ہے
سہما ہوا پنجر نظر آتا ہے
اِس پر بھی زن و مرد ہیں آئینہ بدست
کیا عالمِ تصویر نظر آتا ہے

جو ہے وہ تصنع پہ مٹا جاتا ہے اِس زہر سے جاں بلب ہوا جاتا ہے
رحمت کی گھٹا نہیں تو آندھی ہی اُٹھے فیشن کی ہوا میں دم گھٹا جاتا ہے

مقدور ہو تو دُور کر آلائشِ دل پاکیزگیِ دل سے ہے زیبائشِ دل
آرائشِ تن کا خبط رکھنے والے آرائشِ تن نہیں ہے آرائشِ دل

آموں کا شکریہ

میں گوشہ نشیں ہو کے بھی گم نام نہیں مے خانۂ شہرت میں تہی جام نہیں
ساحرؔ نے بھی امتیاز سے کام لیا بھیجے ہیں جو آم خاص ہیں عام نہیں

متفرق

دُنیا کو ہنر وقار رکھو کر نہ دکھا جوہر اپنا ذلیل ہو کر نہ دکھا
عالم کو دکھا تُو آب داری اپنی لیکن کبھی آبرو ڈبو کر نہ دکھا

کیوں ترکِ مے و جام گوارا کر لوں کیوں خُون رگِ حیات ٹھنڈا کر لوں
تائب ہی اگر نجات کے قابل ہے بہتر ہے کہ توبہ ہی سے توبہ کر لوں

خمریات

فانی ہی سہی یہ عمر باقی نہ سہی — پینے کی ہوس بھی خوش مذاقی نہ سہی
تم گردنِ مینا کو جھکا دو سرِ جام — محفل میں اگر نہیں ہے ساقی نہ سہی

ہم جانتے ہیں کہ پارسائی کیا ہے — اس کے لئے وجہِ لب کشائی کیا ہے
پی جائیں جسے نام خدا کا لے کر — اُس جامِ شراب میں برائی کیا ہے

کیا خوب کہی کہ بادہ نوشی نہ کرو — خواہش کبھی ساغر و سبو کی نہ کرو
یہ وعظ تو موزوں ہے کسی حُجرے میں — مے خانے کو شرمندۂ معنی نہ کرو

جائز ہے کہ مے کو آتشِ تر کہئے — واجب ہے کہ پگھلا ہوا جوہر کہئے
لاتی ہے مگر یہ آسمانوں کی خبر — اس پر ہو یقین تو پیمبر کہئے

وہ ابر اُٹھا آ گئی ساون کی ہوا — اب ہے مئے مشک بو ہر اک دُکھ کی دوا
مفتی نے بھی کر دیا یہ فتویٰ جاری — کل تک جو روا نہ تھی وہ ہے آج روا

وہ آگئی گھنگور گھٹا اے ساقی
توبہ پہ گری برقِ بلا اے ساقی
گردوں سے صدائے وَاشرَبُوا آتی ہے
ہو جائے مجھی سے ابتدا اے ساقی

آئی ہیں گھٹائیں تو بھی آ اے ساقی
محفل کو سیہ مست بنا اے ساقی
ساغر کی ضرورت نہیں مے خواروں کو
مستانہ نگاہوں سے پلا اے ساقی

اچھی سے جو اچھی ہے لنڈھا اے ساقی
یہ رَدّ و بدل نہیں بجا اے ساقی
نوعیتِ مے نہ پوچھ مے خواروں سے
خود تُو نے جو پی ہے وہ پلا اے ساقی

کچھ اوجِ کرم آج دکھا اے ساقی
اُتری ہے جو عرش سے وہ لا اے ساقی
شیشے کی پری کے پر عنایت کر دے
افلاک پہ رندوں کو اُڑا اے ساقی

کچھ اپنی کرامت بھی دکھا اے ساقی
جو کھول دے آنکھیں وہ پلا اے ساقی
ہشیار کو دیوانہ بنایا بھی تو کیا
دیوانے کو ہشیار بنا اے ساقی

لتّے ہیں کچھ اربابِ صفا اے ساقی ۔ ہے سب کو جنونِ اتّقا اے ساقی
ہُو حق کے اثر سے مغز بھی اُن کے ہیں خُشک ۔ اس روگ کی دے اُن کو دوا اے ساقی

مہلک ہیں غم و رنج و عنا اے ساقی ۔ مسموم ہے دُنیا کی ہوا اے ساقی
زہر اس کا رگِ جاں میں نہ ساری ہو جائے ۔ تریاق جو بوتل میں ہے لا اے ساقی

دعوتِ عمل

آؤ ہم سب خادمِ ہندوستاں ہو کر رہیں
اس پھلے پھولے چمن کے باغباں ہو کر رہیں

دردمندوں کی مصیبت کا بیاں ہو کر رہیں
اُن کا دل ہو کر رہیں اُن کی زباں ہو کر رہیں

چھوڑ دیں تفریق سب پر مہرباں ہو کر رہیں
قوم کیا ہوتی ہے اُس کے رازداں ہو کر رہیں

آفتوں میں بے زبانوں کی زباں ہو کر رہیں
درد کے غم کے الم کے ترجماں ہو کر رہیں

کوئی پیاسا دیکھ لیں تو دُور کر دیں تشنگی
کوئی بھوکا ہو تو اُس کے میزباں ہو کر رہیں

آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی غیر کو جرأت نہ ہو
اس طرح اپنے وطن کے پاسباں ہو کر رہیں

پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دیں کبھی
مشکلوں میں کامگار و کامراں ہو کر رہیں

پختگی رنگِ محبت کی نہ زائل ہو کبھی
اس گلستاں میں بہارِ بے خزاں ہو کر رہیں

لوحِ عالم پر بٹھا دیں عظمتِ ماضی کا نقش
نام ور اسلاف کا نام و نشاں ہو کر رہیں

گاڑ دیں اوجِ وفا پر اپنی عظمت کا عَلَم
سرزمینِ ہند پر ایک آسماں ہو کر رہیں

بادۂ اُلفت پلا کر مست کر دیں بزم کو
بے نیازِ ساقی و پیرِ مغاں ہو کر رہیں

رہنما سمجھے ہمیں سب کی نگاہِ جستجو
کارواں کے ساتھ میرِ کارواں ہو کر رہیں

جوشِ محفل میں پڑھے جاؤ یہ مصرع بار بار
آؤ ہم سب خادمِ ہندوستاں ہو کر رہیں

بسنت

پھر نسیم جا بہ جا فرشِ گُل بچھا گئی — پھر بہار پھول کو تخت پر بٹھا گئی
پھر نویدِ زندگی سب کو گُدگُدا گئی — پھر ادائے دل بری معجزہ دکھا گئی
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر ہوا ہے خیمہ زن کاروانِ رنگ و بُو — پھر کلی کے لب پہ ہے داستانِ رنگ و بُو
پھر زمینِ باغ ہے آسمانِ رنگ و بُو — پھر ہے نخلِ طور پر آشیانِ رنگ و بُو
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر مرے کریم نے گنجِ زر لُٹا دیا — پھر چمن کے فرش کو عرش پر بٹھا دیا
پھر جہانِ آرزو دل ربا بنا دیا — پھر حریمِ ناز کو آئینہ دکھا دیا
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر سرور کی گھٹا چھا گئی ہے چار سُو — پھر فضائے دہر میں دلکشی ہے چار سُو
پھر صدائے وانشر بُو گو بجتی ہے چار سُو — پھر طرب ہے جا بہ جا پھر خوشی ہے چار سُو
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر خمارِ زندگی کیف میں بدل گیا — پھر سرو بہ سرمدی جھومتا نکل گیا
پھر فسونِ فصلِ گُل میکشوں پہ چل گیا — پھر عقیق دیکھئے بوتلوں میں ڈھل گیا
پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

معراجِ انسانی

اے بہارِ حُسن کے جویا کبھی جویا بھی ہو
اُلفتِ گُل ہائے تر میں سوکھ کر کانٹا بھی ہو

وسوسہ کوئی نہ رہ جائے دلِ پُر شوق میں
شورشِ دریا بھی ہو خاموشیٔ صحرا بھی ہو

موج میں اپنی بہے جا انکسار و عجز سے
شان تیری اس میں ہے قطرہ بھی ہو دریا بھی ہو

پاک دامانی پہ لے گردِ غمِ اُلفت کے داغ
صحبتِ احباب میں اُجلا بھی رہ میلا بھی ہو

درد میں وہ حُسن پیدا کر کہ درماں ہو نثار
نالۂ مجنوں میں کچھ رعنائیٔ لیلا بھی ہو

اشتیاقِ شاہدِ مقصود کا یہ قول سُن
طالبِ صادق میں ہشیاری بھی ہو سودا بھی ہو

راست بازی کا شجاعت سے بھی ہے رتبہ بلند
اس میں کچھ رُسوائیاں ہوتی ہوں تو رُسوا بھی ہو

تُو بہت قربانِ حسنِ ماسوا پر ہو چکا
اپنے حسنِ انجمن افروز کا شیدا بھی ہو

منزلِ مقصود کا پانا تو مشکل ہی نہیں
تو نے سرگرمی سے منزل کو کبھی ڈھونڈا بھی ہو

جسم کی تاب و تواں پر ناز کرنا چھوڑ دے
وارِ شمشیرِ حوادث کا اگر اوچھا بھی ہو

سعیٔ پیہم میں مقدر کی کبھی پروا نہ کر
تیرے حق میں وہ بُرا ہو یا بھلا جیسا بھی ہو

عزمِ راسخ داری و پائے ترا معذور نیست
بر نصیبِ خویش نازاں شو کہ منزل دُور نیست

انقلابِ زمانہ

کہاں یہ دن کہ حُسن خود نما ہے ننگِ عُریانی ... کہاں وہ دن کہ عشقِ جاں گزا بھی دل میں پنہاں تھا
کہاں یہ دن کہ ظاہر رنگِ باطن کو چھپاتا ہے ... کہاں وہ دن کہ باطن رنگِ ظاہر سے نمایاں تھا
کہاں یہ دن کہ صدہا خار ہیں ہر گُل کے دامن میں ... کہاں وہ دن کہ ہر کانٹا چمن کا گُل بہ داماں تھا
کہاں یہ دن کہ جینے کو ہے خوابِ مرگ کی حسرت ... کہاں وہ دن کہ خوابِ مرگ کو جینے کا ارماں تھا

مفلسی و بے چارگی

ہر شاخِ بلند عندلیبوں کے لئے ... طالع کا عروج خوش نصیبوں کے لئے
اقبال کا اوج منعموں کا حصّہ ... ہر وقت کی اُفتاد غریبوں کے لئے

مفلس ہیں کہ ہر جَور کو سہ جاتے ہیں ... غصّے میں بھی لب ہلا کے رہ جاتے ہیں
ملتی ہے یہ داد اہلِ زر سے اُن کو ... جو بات نہ کہنے کی ہو کہہ جاتے ہیں

گُھٹ گُھٹ کے رہی دل میں فغانِ درویش ... بے کار دہن میں ہے زبانِ درویش
کہتا ہے اگر ایک تو سو سُنتا ہے ... قہرِ درویش ہے بہ جانِ درویش

رنگِ قدیم

وہی چال اب تک ہے نبضِ سخن کی
وہی عشق و اُلفت کی بیماریاں ہیں

وہی دورِ ساغر وہی بزمِ ساقی
وہی چشمِ مے گوں کی سرشاریاں ہیں

وہی ضعفِ تن ہے وہی ضعفِ دل ہے
وہی کوہِ غم کی گراں باریاں ہیں

وہی بُلبُلیں ہیں وہی آشیانے
وہی آتشِ گُل کی چنگاریاں ہیں

وہی عشق کو سر فروشی کا دعوےٰ
وہی حُسن کی گرم بازاریاں ہیں

وہی بُت وہی اُن کی بے گانگی ہے
وہی ہم وہی ناز برداریاں ہیں

حقیقتِ حال

کہیں ابرِ تر کی گہر باریاں ہیں
کہیں آتشِ غم کی چنگاریاں ہیں

کہیں جام میں ہے مئے ارغوانی
کہیں دیدۂ تر کی خوں باریاں ہیں

بچھائے ہیں تہذیبِ حاضر نے پھندے
گرفتاریوں پر گرفتاریاں ہیں

امیروں کے لب پر مسرت کے نغمے
غریبوں کے گھر میں عزاداریاں ہیں

کیا سب کو مجبور مجبوریوں نے
قیامت کے فتنے یہ مختاریاں ہیں

کوئی ان کا مرنا ہی آسان کر دے
جنھیں سانس لینے میں دشواریاں ہیں

مشرق و مغرب

نہ دل داریاں ہیں نہ غم خواریاں ہیں
دکھاوے کی ساری اداکاریاں ہیں

اِدھر اہلِ مشرق کا سودائے اُلفت
اُدھر اہلِ مغرب کی بے زاریاں ہیں

اِدھر اُن کے حصّے ہیں خوابیدہ بختی
اُدھر اُن کے طالع کی بیداریاں ہیں

اِدھر فطرتِ پست محکومیوں کی
اُدھر اوج پر حکم برداریاں ہیں

اِدھر ہوشیاری بھی ہے خوابِ غفلت
اُدھر خوابِ غفلت کی ہشیاریاں ہیں

اِدھر دل دہی ہے دل آزاریوں پر
اُدھر دل دہی پر دل آزاریاں ہیں

اِدھر بے گناہی بھی ہے پُر گناہی
اُدھر پاک دامن گنہ گاریاں ہیں

اِدھر سادہ لوحی کی آنکھوں میں آنسو
اُدھر خندہ زن اُن کی عیاریاں ہیں

ہولی

چمن چمن میں نویدِ بہار ہے ہولی
نزولِ رحمتِ پروردگار ہے ہولی

بہارِ رفتہ کی حسرت میں بیٹھنے والے
نظر اُٹھا کہ سراپا بہار ہے ہولی

سچّی باتیں

دُنیا میں سفیہوں کو شرافت نہیں ملتی
دَولت بھی لُٹا دیں تو یہ دَولت نہیں ملتی

اک وہ ہیں کہ فارغ ہیں غم و رنج والم سے
اک ہم ہیں کہ دم بھر جنھیں راحت نہیں ملتی

اعمال جب اچھے ہوں تو کیا کچھ نہیں ملتا
عزّت نہیں ملتی کہ فضیلت نہیں ملتی

بہتات ہے ہر جنس کی بازارِ جہاں میں
لیکن نہیں ملتی تو مسرّت نہیں ملتی

ملتا نہیں مل بیٹھنے والوں کو مزا کچھ
جب تک کہ طبیعت سے طبیعت نہیں ملتی

اغیار کے پیغامِ محبّت کو کریں کیا
آپس ہی کے جھگڑوں سے فراغت نہیں ملتی

آفات پہ آفات اُترتی ہیں فلک سے
کیا قہر ہے دم لینے کی مہلت نہیں ملتی

کیوں گھر سے چلے عرضِ ہنر کے لئے اے جوشؔ
اس جنس کی بازار میں قیمت نہیں ملتی

جنابِ داغ مرحوم کی شان میں

نقش دل پر ہے زبانِ داغ کا
سکّہ بیٹھا ہے بیانِ داغ کا

محوِ نظّارہ نہ ہو کیوں چشمِ شوق
ہے نیا منظر جہانِ داغ کا

نور برساتا رہے گا حشر تک
ہر ستارہ آسمانِ داغ کا

جھک گیا جو ہو گیا وہ سربلند
فیض ہے یہ آستانِ داغ کا

قومی انتشار سنہ ۱۹۳۰ء

مل گئی سب خاک میں شانِ نشانِ اتحاد
آ رہا گو باز ہیں .. بر آسمانِ اتحاد

جن کے پلے میں رہی جنسِ گرانِ اتحاد
بیچتے پھرتے ہیں اب وہ استخوانِ اتحاد

ہم تجھے اے گرمیِ بازارِ عالم کیا کریں
دن دہاڑے لٹ گئی اپنی دکانِ اتحاد

عالمِ مہر و وفا میں شور ہے ماتم کا آج
آں جہانی ہو گیا شاید جہانِ اتحاد

دل کے ہر گوشے میں ڈھونڈ آئی نگاہِ جستجو
نام کو بھی اب نہیں ملتا نشانِ اتحاد

منہ سے جو کہتے ہیں اُس پر خود عمل کرتے نہیں
دوستانِ ملک بھی ہیں دشمنانِ اتحاد

وائے بے دردی کہ ہم برفاب خود پیتے رہے
پیاس سے نکلی رہی باہر زبانِ اتحاد

لنگرِ تدبیر سے کچھ کام لے اے ناخدا
لے اُڑی بادِ مخالف بادبانِ اتحاد

قومی انتشار (سنہ ۱۹۴۵ء)

اے وطن اے نوحہ خوانِ اتحاد
کیا ہوئی تیری وہ شانِ اتحاد

سایہ افگن تھا ترے سر پر کبھی
سب سے اونچا آسمانِ اتحاد

بے نشانی کیوں گوارا ہے تجھے
چھوڑ کر اپنا نشانِ اتحاد

کیا ہوئی تیری بصارت کیا ہوئی — نفرقے پر ہے گمانِ اتحاد
کیوں نہیں انجام پر تیری نظر — حیف اے نافدردانِ اتحاد
ایک وہ ہیں جن کی عظمت دیکھ کر — داد دیتی ہے زبانِ اتحاد
ایک تو ہے جس کی ہر افتاد پر — خندہ برلب ہے جہانِ اتحاد
موت بھی ہے اُن کی ٹھکرائی ہوئی — زندگی جن کی ہے جانِ اتحاد
غیر کے در پر یہ سجدے تا کجا — ڈھونڈ کوئی آستانِ اتحاد
ریزہ ریزہ تیرے سنگِ راہ کا — کہ رہا ہے داستانِ اتحاد
تیر اندازی کرے گا کس طرح — توڑ کر اپنی کمانِ اتحاد

اے وطن اے نوحہ خوانِ اتحاد

اخباری فرمائشیں

ہر طرف سے یہ تقاضا ہر طرف سے یہ پکار — بندہ پرور نظم بھیجو کرشن نمبر کے لئے
دید کے قابل ہے یہ ہنگامۂ جوشِ طلب — کتنے مے کش مر رہے ہیں ایک ساغر کے لئے
اتنی نظمیں اور وہ بھی ایک ہی عنوان پر — سخت مشکل ہیں مصیبت ہیں سخن ور کے لئے
کاش اتنا پوچھتا ان مہربانوں سے کوئی — خون کتنا چاہیئے اک مصرعِ تر کے لئے

شامِ جوانی

کچھ دین کا ہے ہوش نہ ایمان کی خبر ہے
دُنیا پہ توجہ ہے نہ عقبیٰ پہ نظر ہے
راحت کی جگہ سوزِ جگر دردِ جگر ہے
دل رنج کا افکار کا آلام کا گھر ہے
اے شامِ جوانی تُو مُصیبت کی سحر ہے

پروانے تری بزم میں جلتے ہوئے دیکھے
شعلے دلِ سوزاں سے نکلتے ہوئے دیکھے
فتنے تری آغوش میں پلتے ہوئے دیکھے
چشمے تری سوزش کے اُبلتے ہوئے دیکھے
اے شامِ جوانی تُو مصیبت کی سحر ہے

ہر گُل ترے گُل زار میں کانٹا نظر آیا
ہر جلوہ ترا داغِ تمنّا نظر آیا
گیسُو میں ترے پیچ بلا کا نظر آیا
سایہ ترا آسیب سراپا نظر آیا
اے شامِ جوانی تُو مصیبت کی سحر ہے

آنا ترا تمہیدِ غم و رنج و بلا ہے
جانا ترا سب کے لئے پیغامِ قضا ہے
آشوبِ زمانہ ترے قدموں پہ فدا ہے
دامانِ قیامت ترے دامن سے بندھا ہے
اے شامِ جوانی تو مصیبت کی سحر ہے

کب تک میں دلِ مضطرب احوال کو دیکھوں
کب تک میں ترے دبدبہ و سال کو دیکھوں
کب تک ترے پیکر کے خد و خال کو دیکھوں
دیکھوں تجھے یا شامتِ اعمال کو دیکھوں
اے شامِ جوانی تُو مصیبت کی سحر ہے

آنسو

اشک کہتا ہے بتاؤ تو مجھے کیا میں ہوں
چیستاں ہوں نہ پہیلی نہ معمّا میں ہوں

سر بسر رنج و غم و یاس کی تصویر ہوں میں
ہمہ تن حسرت و اندوہ و تمنّا میں ہوں

دل کے ڈوبے ہوئے ارمان ہیں لاکھوں مجھ میں
لوگ قطرہ جسے کہتے ہیں وہ دریا میں ہوں

عہدِ طفلی میں ملا داغِ یتیمی مجھ کو
اپنی پھوٹی ہوئی تقدیر کو روتا میں ہوں

ہو گیا آگ سے پانی کا نکلنا ثابت
دل میں کچھ سوز ہو پیدا تو ہویدا میں ہوں

آئینہ لوگ مجھے سمجھیں وہ حیران ہوں میں
آنکھ جس پر سے نہ اُٹھّے وہ تماشا میں ہوں

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج
جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادا میں ہوں

شورِ فریاد و فغاں کیوں نہ مرے ساتھ رہے
آرزوئے دلِ مضطر کا جنازا میں ہوں

ہو گا دُنیا میں نہ مجھ سا بھی کوئی تر دامن
اپنی ہی شرم و خجالت کا پسینا میں ہوں

گر پڑا آنکھ سے منّت کشِ مژگاں نہ ہُوا
مل گیا خاک میں شرمندۂ احساں نہ ہُوا

تلخ کامی کا مزا سب کو چکھا دیتا ہوں
زہر کے گھونٹ مسیحا کو پلا دیتا ہوں

میری چُپ میں بھی تو ہے شورِ قیامت کا اثر
سیکڑوں فتنۂ خوابیدہ جگا دیتا ہوں

کیا ہے ساون کی جھڑی میری جھڑی کے آگے
آبروئے ابر کی پانی میں بہا دیتا ہوں

گر پڑوں چشمِ یتامے سے اگر خاک پہ میں
کنگرہ عرشِ معلیٰ کا ہلا دیتا ہوں

میں برس جاؤں اگر ابرِ ندامت بن کر
حرف سب دفترِ عصیاں کے مٹا دیتا ہوں

بند کر دیتا ہوں دم تیغِ دو دم کا دم میں
معجزہ اپنا قضا کو بھی دکھا دیتا ہوں

ابرِ رحمت مری ہر بوند مقرر سمجھو
شعلۂ برقِ جہاں سوز بجھا دیتا ہوں

لوگ اس واسطے غماز مجھے کہتے ہیں
جو چھپا رکھنے کی باتیں ہیں بتا دیتا ہوں

راز افشا نہ کروں یہ مرے بس کی نہیں بات
اپنے نافہم عزیزوں کو دعا دیتا ہوں

ضبطِ گریہ میں کوئی میرا اثر کیا جانے
اس کو وہ جانے جو ہیرے کی کنی کھا جانے

گھر جلا دیتا ہوں میں برق بہ داماں ہو کر
ناخدا کو بھی ڈبو دیتا ہوں طوفاں ہو کر

عالمِ یاس کے گوشوں میں لئے پھرتی ہے
گردشِ چشم مجھے گردشِ دوراں ہو کر

شمعِ ہستی کو بجھا دیتی ہے صرصر کی طرح
جنبشِ دستِ اجل جنبشِ مژگاں ہو کر

اک زمانے کی نگاہوں سے گرا کر چھوڑا
میرے سجدوں نے مجھے بازیِ طفلاں ہو کر

قفسِ موئے مژہ سے ہے رہائی مر کر
عمر کٹتی ہے مری قیدیِ زنداں ہو کر

پانی سورج کو دیا کرتا ہوں ہندو کی طرح
حج کیا کرتا ہوں دیں دارِ مسلماں ہو کر

بارِ صد کوہِ الم کے ہیں برابر اُترا — چشمِ گریاں سے جو قطرہ بکفِ مژگاں ہو کر
آئینہ خانۂ عالم کو جو دیکھا ہیں نے — بن گیا آپ ہی آئینہ میں حیراں ہو کر
باعثِ خندۂ اربابِ نظر کر ڈالا — لغزشِ پائے کسی رند کا ایماں ہو کر

ننگِ مخلوق ہوں میں سامنے کیوں کر آؤں
جی میں آتا ہے کہ ہیرے کی کنی کھا جاؤں

غم نصیبوں کا غم و رنج میں غم خوار ہوں میں — دُکھ میں ساتھی ہوں مصیبت میں مددگار ہوں میں
نہیں معراج سے کم نوکِ مژہ کی سُولی — حق تو یہ ہے کہ سرِ دار بھی سر دار ہوں میں
جاؤں کعبے میں تو ہوں عابدِ تسبیح بدست — آؤں مندر میں تو باندھے ہوئے زنار ہوں میں

کبھی میں آگ کلیجے کی بجھا دیتا ہوں — خرمنِ دل پہ کبھی برقِ شرربار ہوں میں
بزم میں فرطِ خوشی کی میں علامت ہوں کبھی — کبھی راحت کے جنازے کا عزادار ہوں میں
ژالہ باری ہے کبھی کشتِ امل پر میری — دامنِ دل پہ کبھی ابرِ گہربار ہوں میں
کبھی اک قطرہ ہے پانی کا حقیقت میری — کبھی اُمڈا ہوا اک قلزمِ زخار ہوں میں
کبھی اپنوں کا ہے رونا کبھی غیروں کا ہے غم — مختصر یہ کہ مصیبت میں گرفتار ہوں میں
تیرے ہی فضل و کرم پر ہے بھروسا یا رب — اک خطاوار سیہ کار گنہگار ہوں میں

توشہ کچھ پاس نہیں اشکِ ندامت کے سوا
آسرا کوئی نہیں اک تری رحمت کے سوا

ایک مکتوب

فدا صاحب کے اس خط کا جواب جو اُنھوں نے برہمن گزٹ کی قلمی اعانت کے لئے تحریر فرمایا

اے فدا لکھا خطِ فرحت نمط جو آپ نے
جی میں آتا ہے کہ اس خط پر فدا ہو جائیے

اک تہی دامن کو جانا آپ نے ابرِ کرم
اور یہ چاہا کہ ہم پر بھی کرم فرمائیے

قوم کے ماتم میں شاید آپ کی خواہش یہ ہے
اک حبیبِ مدح گو سے مرثیہ لکھوائیے

قوم سمجھی تھی نہ سمجھی ہے نہ سمجھے گی کبھی
کس طرح سمجھاؤں اس کو یہ مجھے سمجھائیے

ایک تو خوابِ گراں اور اُس پہ یہ گوشِ گراں
کون سی اُمّید پر زنجیرِ در کھڑکائیے

بے نوا کا گھر دکھا کر دل لگی کی آپ نے
کہ دیا مجھ سے کہ دامانِ ہوس پھیلائیے

آج تو اک نظم لکھنے کے لئے تاکید ہے
کل کہیں گے آپ کچھ چندہ ہمیں بھجوائیے

یاد آتا ہے کسی کا برمحل مصرع مجھے
شعر اگر کہیے تو روٹی کس کے گھر سے کھائیے

دست کار

اے مربیِ جہاں اے دست کار — کس سے ہو تیرے فضائل کا شمار
دھوم ہے دُنیا میں تیرے کام کی — مُہر ہے ہر شے پہ تیرے نام کی
جیتے ہیں سب اپنے مطلب کے لئے — تیری محنت ہے مگر سب کے لئے
شہر میں سامانِ عشرت تجھ سے ہے — گاؤں میں آرام و راحت تجھ سے ہے
اپنے بیگانے کی خدمت تُو نے کی — پھل ملا اوروں کو محنت تُو نے کی
تُو نہ ہو تو آگ جل سکتی نہیں — فاقہ کش کی موت ٹل سکتی نہیں
تن کی عریانی کو پوشش تُو نے دی — حسن کو زینت کی خواہش تُو نے دی
جان ہر شے میں دکھا دیتا ہے تُو — بولتی چڑیا بنا دیتا ہے تُو
تُو نے رنگِ زیست سب میں بھر دیا — تُو نے پتھر کو بھی زندہ کر دیا
تیغ کو پانی پلا سکتا ہے تُو — ناؤ کاغذ کی بہا سکتا ہے تُو
تُو پرِ پرواز ہے ہر تیر میں — تیرا جوہر ہے دمِ شمشیر میں
راکھ کو سونا بنا سکتا ہے تُو — زہر میں امرت دکھا سکتا ہے تُو
الغرض ہر سمت تیرا راج ہے — تاجِ شاہی تک ترا محتاج ہے

مفلس کی عید

ایک مفلس عید کے دن رو کے یہ کہنے لگا
چارۂ دردِ فلاکت میں کروں تو کیا کروں

کون سنتا ہے یہاں فریادِ بے مقدور کی
اپنی قسمت کی شکایت میں کروں تو کیا کروں

آنکھ میں آنسو بھر آئے ہاتھ خالی دیکھ کر
عید کی خوشیوں میں شرکت میں کروں تو کیا کروں

جو مجھے دینا تھا وہ دفتر میں پہلے لکھ لیا
اے مرے رزاق حجت میں کروں تو کیا کروں

ہائے یہ دریائے عشرت ہائے یہ موجِ نشاط
ڈوبی جاتی ہے طبیعت میں کروں تو کیا کروں

بارِ فاقہ سے ہوئی ایک ایک پل مجھ کو گراں
چار دن جینے کی حسرت میں کروں تو کیا کروں

گڑ گئی ہے پاؤں پر شرمِ تہی دستی سے آنکھ
روئے ساقی کی زیارت میں کروں تو کیا کروں

ایک تو قیدِ قفس اس پر یہ بے بال و پری
باغ تک اڑنے کی ہمت میں کروں تو کیا کروں

ہاتھ میں پاتا نہیں کوڑی کفن کے واسطے
امتحانِ تیغِ الفت میں کروں تو کیا کروں

شورِ محشر سے بھی اس کی آنکھ کھل سکتی نہیں
بختِ خوابیدہ کی منت میں کروں تو کیا کروں

اک یہی جانِ حزیں صبر آزما درد آفریں
سوچتا ہوں شکرِ نعمت میں کروں تو کیا کروں

یہ وہ ہے دریائے غم جس کا کنارا ہی نہیں
ناخدا سے عرضِ حاجت میں کروں تو کیا کروں

بہرِ خواری بس کہ سرگرمِ تلاشم کردہ اند
پارۂ نزدیک در ہر دُور باشم کردہ اند
— غالب

مہاتما گاندھی کی عظمت

عظمتِ گاندھی پہ ابنائے وطن کو ناز ہے — کانگرس ہی کو نہیں ہر انجمن کو ناز ہے

وہ غریبوں کا سہارا وہ کسانوں کا رفیق — مہرباں تو مہرباں نامہربانوں کا رفیق

کس بلندی پر رہا اس کا خرامِ زندگی — پست حالوں میں کہاں ایسا مقامِ زندگی

شان و شوکت اُس کے ترکِ آرزو سے دم بخود — جاہ و حشمت اس کے ذوقِ جستجو سے دم بخود

گنجِ قاروں ایک مُردہ اس کا دفنایا ہوا — تاجِ شاہی اس کے استغنا کا ٹھکرایا ہوا

مشکلوں میں اس کی ہمت اس کی جرأت کامیاب — ہم نے دیکھی ہر جگہ اس کی سیاست کامیاب

تیر سے مطلب رہا جس کو نہ تیغِ تیز سے — اُس نہتّے نے حکومت چھین لی انگریز سے

سب کو حیرت ہے کہ اس نے کیا یہ جادو کر دیا — بزدلوں میں کس طرح شیروں کا دم خم بھر دیا

قید خانہ اس کے دم سے اک زیارت گاہ تھا — جیل میں بھی بند رہ کر وہ چراغِ راہ تھا

اس کے لاغر جسم سے لرزاں جلال انگریز کا — ہیچ اس کے سامنے سارا کمال انگریز کا

زندگی اس شان کی تھی موت بھی اس شان کی — خدمتِ اہلِ وطن میں جان تک قربان کی

آہ اے مرحوم تیرا نیک ہونا جرم تھا — قوم کے اجزا کا گویا ایک ہونا جرم تھا

تیرے اُٹھ جانے سے تو سارا جہاں ماتم میں ہے — کون کہتا ہے فقط ہندوستاں ماتم میں ہے

اتحادِ باہمی کی وہ صدائیں اب کہاں　　غیریت کو جو اُڑا دیں وہ ہوائیں اب کہاں
رہ نما کس کو بنائیں رہ نمائی ہو چکی　　ناخداؤں سے اب ایسی ناخدائی ہو چکی

غلامی ۔ ۱۹۴۵ء

غلامی قاتلِ روحِ بشر ہے　　رگِ جاں پر یہ نوکِ نیشتر ہے
نہاہی خیز اس کا ہر اثر ہے　　نہایت تلخ اس کا ہر ثمر ہے
غلامی سے خدا سب کو بچائے

غلامی اک مصیبت ہے بلا ہے　　بد اعمالیِ انساں کی سزا ہے
بقا کیسی یہ پیغامِ فنا ہے　　اسے قہرِ خدا کہنا بجا ہے
غلامی سے خدا سب کو بچائے

غلامی گھاٹ ہے بحرِ فنا کا　　یہ مہلک وار ہے تیغِ قضا کا
اسے پیکاں کہو تیرِ جفا کا　　یہ پھندا سخت ہے دامِ بلا کا
غلامی سے خدا سب کو بچائے

غلامی دشمنِ تاب و تواں ہے　　غلاموں میں سکت باقی کہاں ہے
غلامی بے کسی کا اک نشاں ہے　　یہ داغِ دامنِ ہندوستاں ہے
غلامی سے خدا سب کو بچائے

شہیدانِ وطن - ۱۹۴۹ء

دیکھیے ان جینے والوں کا نشانِ زندگی — دیکھیے ان مرنے والوں کا جہانِ زندگی
دیکھیے ان پستیوں میں آسمانِ زندگی — دیکھیے ان خاک کے ذرّوں کی شانِ زندگی

بیٹھیے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

دیکھیے روحِ وفا کیا کیا اُبھرتی ہے یہاں — دیکھیے حبِّ وطن دل میں اُترتی ہے یہاں
دیکھیے دل کی فضا کیسی نکھرتی ہے یہاں — دیکھیے رحمت خدا کی طوف کرتی ہے یہاں

بیٹھیے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

اس جگہ بے رنگیاں بھی عالمِ تصویر ہیں — اس جگہ تاریکیاں بھی شمع کی تنویر ہیں
اس جگہ خاموشیاں بھی اک لبِ تقریر ہیں — اس جگہ رُوپوشیاں بھی دل کی دامن گیر ہیں

بیٹھیے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

اُٹھ گئے دُنیا سے لیکن ایک دُنیا ہو گئے — بُلبُلے پانی کے تھے ٹوٹے تو دریا ہو گئے
یہ وہ تھے ذرّات جو اُڑ کر ثریا ہو گئے — یہ وہ تھے بیمار جو مر کر مسیحا ہو گئے

بیٹھیے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

سونے والوں کو یہاں بیدار ہوتے دیکھیے — مست رندوں کو یہاں ہشیار ہوتے دیکھیے
تیرگی کو اس جگہ انوار ہوتے دیکھیے — تشنگی کو اس جگہ سرشار ہوتے دیکھیے

بیٹھیے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

دل کے اُجڑے باغ کو آباد ہوتے دیکھئے
روح کی افسردگی کو شاد ہوتے دیکھئے
بندگی کو قید سے آزاد ہوتے دیکھئے
پرشکستہ صید کو صیاد ہوتے دیکھئے

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

آیئے اس خاک سے کسبِ فضیلت کیجئے
آیئے قربان اس پر دل کی دولت کیجئے
ہاں ذرا رک جایئے اتنی نہ عجلت کیجئے
اس زیارت گاہِ عالم کی زیارت کیجئے

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

فسادات ۔ ۱۹۴۷ء

وہ ہوا بگڑی کہ دل بے تاب ہو کر رہ گیا
برقِ مضطر بن گیا سیماب ہو کر رہ گیا
آگ برسی اس قدر معصومیت کی جان پر
سخت پتھر کا بھی زہرہ آب ہو کر رہ گیا
سازِ آزادی نے چھیڑا تھا جو نغمہ بزم میں
ہر زباں پر نوحۂ پنجاب ہو کر رہ گیا
آہ وہ جوہر جسے تھی آرزوئے دورِ جام
ہر رگِ انگور میں زہراب ہو کر رہ گیا
آرزوئے سیرِ گُل بھی خارِ حسرت بن گئی
پھول بھی داغِ دلِ احباب ہو کر رہ گیا
شادمانی کی تمنا اشک بن کر رہ گئی
خوابِ راحت کا زمانہ خواب ہو کر رہ گیا

کیا لکھے اہلِ وطن کے دل کی بے تابی کوئی
لکھنے والا خود دلِ بے تاب ہو کر رہ گیا

یومِ آزادی - سنہ ۱۹۴۷ء

وہ نعمت مل گئی جس کے لئے قربانیاں کی تھیں
امید و یاس کے میدان میں جولانیاں کی تھیں

جفائیں سہ کے انگریزوں کی نافرمانیاں کی تھیں
محبانِ وطن کے خون کی ارزانیاں کی تھیں

وطن والو مبارک ہو کہ آزادی کا دن آیا

یہی تو ہے وہ آزادی تِلک جس کا پجاری تھا
اسی کے جوش میں اک لاجپت لاکھوں پہ بھاری تھا

اسی میدان میں گاندھی کو شوقِ شہ سواری تھا
یہی تو وہ جنون تھا نام جس کا ہوشیاری تھا

وطن والو مبارک ہو کہ آزادی کا دن آیا

اس آزادی پہ ہم نے ہر خوشی قربان کر دی ہے
متاعِ عزت و ناموس بھی قربان کر دی ہے

شہیدانِ وفا نے زندگی قربان کر دی ہے
بڑی دولت جو اپنے پاس تھی قربان کر دی ہے

وطن والو مبارک ہو کہ آزادی کا دن آیا

یہ وہ دیوی ہے ہم مدت سے جس کی راہ تکتے تھے
اسی کی جستجو میں اس کے دیوانے بھٹکتے تھے

اسی کی چاہ میں ہر آنکھ سے آنسو ٹپکتے تھے
اسی کی یاد میں شعلے محبت کے بھڑکتے تھے

وطن والو مبارک ہو کہ آزادی کا دن آیا

اس آزادی کی قیمت خطۂ پنجاب سے پوچھو
دلِ بے تاب کا عالم دلِ بے تاب سے پوچھو

کٹی کیوں کر شبِ غم دیدۂ بے خواب سے پوچھو
جفا کیا کیا سہی اُجڑے ہوئے احباب سے پوچھو

وطن والو مبارک ہو کہ آزادی کا دن آیا

ابھی ابرِ بلا سر پر ہے لیکن چھٹ ہی جائے گا
یہ مشکل وقت کٹتے کٹتے آخر کٹ ہی جائے گا

وطن کے دشمنوں کا زور بڑھ کر گھٹ ہی جائے گا
اندھیری رات کا پردہ سحر تک پھٹ ہی جائے گا

وطن والو مبارک ہو کہ آزادی کا دن آیا

انجامِ بہار

لطفِ صحبت حسرتِ دیدار بن کر رہ گیا
ہر تبسّم آہِ آتش بار بن کر رہ گیا

دل میں جو ارمان تھا آزار بن کر رہ گیا
پھول جو پھولا چمن میں خار بن کر رہ گیا

کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی[1]

انقلابِ آسماں ہے گردشِ ایام ہے
اب نہ ساقی ہے نہ محفل ہے نہ وہ جام ہے

کیا تمنائے مسرت اک خیالِ خام ہے
کیا جہانِ رنگ و بو اُجڑے چمن کا نام ہے

کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

کیا سرورِ کامرانی کا یہی انجام تھا
کیا وفورِ شادمانی کا یہی انجام تھا

کیا نویدِ نوجوانی کا یہی انجام تھا
کیا اُمیدِ زندگانی کا یہی انجام تھا

کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

[1] یہ مصرع جناب دل شاہجہانپوری کا ہے۔ جسے بطور ترجیع استعمال کیا گیا ہے۔

کیا الم انجام دیکھا ہم نے آغازِ طرب — آہ بن کر رہ گئی ہر ایک آوازِ طرب
اب نہ وہ نغمۂ مسرت کے نہ وہ سازِ طرب — آسماں اتنا ہوا کیوں رخنہ اندازِ طرب

کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

خاک اُڑاتی پھرتی ہے بادِ خزاں چاروں طرف — چھا گئی ہیں باغ پر بربادیاں چاروں طرف
منتشر ہیں بلبلوں کے استخواں چاروں طرف — دیکھتی ہے آنکھ عبرت کے نشاں چاروں طرف

کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

ترا دیوانہ

صبوحی کش ہوائے ساغر و مینا میں رہتا ہے — فرشتہ نُور بن کر عالمِ بالا میں رہتا ہے
کوئی دوزخ میں کوئی جنّت الماویٰ میں رہتا ہے — نہ گلشن ہی میں رہتا ہے نہ وہ صحرا میں رہتا ہے

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

نظر کے سامنے جو کچھ ہے اس کو ماسوا سمجھے — حرم کو بُت کدے کو وہ کسی کا نقشِ پا سمجھے
جسے ہم انتہا کہتے ہیں اس کو ابتدا سمجھے — کوئی یہ بھید کیا جانے کوئی یہ راز کیا سمجھے

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

کبھی روتے ہوئے ہنگامہ پُر جوش ہو جانا — کبھی سازِ شکستہ کی طرح خاموش ہو جانا
کبھی بیگانہ صورت سے بھی ہم آغوش ہو جانا — کبھی اپنی نظر سے آپ ہی رُوپوش ہو جانا

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ خندہ زن ہے عقل و حکمت پر جنوں اس کا — کوئی خم خانۂ معنی ہے جام واژگوں اس کا
زمانے بھر میں ہل چل ڈالنے والا سکوں اس کا — لگا دے آگ ہفت افلاک میں سوز دروں اس کا

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

چمن کو شہر کو بستی کو ویرانہ سمجھ لینا — بیان جنت و دوزخ کو افسانہ سمجھ لینا
خوشی کی عیش کی محفل کو غم خانہ سمجھ لینا — خرد سے ہوش سے دنیا کو بیگانہ سمجھ لینا

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

ہمیشہ اس کی چشم تر کے آنسو مسکراتے ہیں — ہمیشہ اس کے نالے نغمۂ شیریں سناتے ہیں
ہمیشہ اس کے تقوے کی قسم مے خوار کھاتے ہیں — ہمیشہ اس کی مے نوشی سے تائب فیض پاتے ہیں

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

جہان رنگ و بو کو دخل کیا اس کی طبیعت میں — جگہ پائی نہیں جنت بھی اس کے باغ فطرت میں
نیا سودا نئی شورش ہے اس کے جوش الفت میں — وہ اس دنیا کی حسرت میں نہ اس دنیا کی حسرت میں

خدا جانے ترا دیوانہ کس عالم میں رہتا ہے

برسات

ہوتی ہیں نور پیکر برسات کی گھٹائیں — رکھتی ہیں خاص منظر برسات کی گھٹائیں
کتنی ہیں روح پرور برسات کی گھٹائیں — تم بھی تو دیکھو اٹھ کر برسات کی گھٹائیں

کیا جھومتی ہیں سر پر برسات کی گھٹائیں

ضبطِ نوا کے صدمے کب تک سہے پپیہا مے کش چہک رہے ہیں کیوں چپ رہے پپیہا
طوفانِ رنج و غم میں اب کیوں بہے پپیہا اب کیوں نہ مست ہو کر پی پی کہے پپیہا
برسا رہی ہیں ساغر برسات کی گھٹائیں

اک فیلِ تیز رو ہے نیلم کی ہے عماری چلتے ہیں اردلی میں دَل بادلوں کے بھاری
لیکن کھلا نہ ہم پر یہ کس کی ہے سواری کس برق وش کے رُخ کی کرتی ہیں پردہ داری
تانے ہوئے ہیں چادر برسات کی گھٹائیں

کس شان سے سجا ہے بزمِ طرب کا ساماں اِندر کا اک اکھاڑا دُنیا میں ہے نمایاں
حیرت سے پُوچھتے ہیں عالم کے جن و انساں سقفِ فلک کے نیچے یہ ناچتی ہیں پریاں
یا کاٹتی ہیں چکر برسات کی گھٹائیں

سینے میں دم تمھارا چلنے سے پھُولتا ہے اس عذرِ نازکی کو بندہ قبولتا ہے
لیکن اِدھر تو دیکھو دل غم کو بھُولتا ہے جھُولے پہ شاخِ گل کے ہر پھُول جھُولتا ہے
رقصاں ہیں اس کے سر پر برسات کی گھٹائیں

زانو پہ آپ حضرت کیوں سر دھرے ہوئے ہیں کیوں خوش دلی کے جذبے اتنے مرے ہوئے ہیں
باہر نکل کے دیکھو جل تھل بھرے ہوئے ہیں شاداب ہر چمن ہے جنگل ہرے ہوئے ہیں
برسی ہیں آج گھر گھر برسات کی گھٹائیں

اپنے ہنر کا حضرت کچھ نقش بھی بٹھاؤ
اس بزم میں نہ تانیں بے وقت کی اُڑاؤ

حُبِ وطن ہو جس میں وہ گیت بھی تو گاؤ
دُھرپت کو جوش چھوڑو کچھ دیس میں سناؤ

چھائی ہیں بندہ پرور برسات کی گھٹائیں

وطن

شادماں رکھتی ہے دل کو یادِ یارانِ وطن
ہے مرا صحرائے غربت بھی گلستانِ وطن

اس سے بڑھ کر اور کیا مذکور ہو شانِ وطن
عرشِ اعظم سے بھی کچھ اُونچا ہے ایوانِ وطن

دم اگر نکلے تو نکلے زیرِ دامانِ وطن
دوش پر بکھری رہے زلفِ پریشانِ وطن

رو رہی ہے شام سے شمعِ شبستانِ وطن
تُو کہاں ہے اے بہارِ صبحِ خندانِ وطن

سرفروشوں ہی کے دم سے ہے وطن کی زندگی
جان پر جو کھیل جائیں ہیں وہی جانِ وطن

بن کے پُتلی جو سما جائیں وطن کی آنکھ میں
مورچھل جھلتا ہے اُن کو دستِ مژگانِ وطن

اے زمینِ ہند کچھ گنتی بھی تجھ کو یاد ہے
تجھ میں پنہاں ہو گئے کتنے شہیدانِ وطن

بارگاہِ حق میں ہے اے جوش یہ میری دُعا
رات دن پھُولا پھلا دیکھوں گلستانِ وطن

فرقہ وارانہ فسادات ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

تماشا دیکھنے کو آگ خود گھر میں لگالی ہے
مرے اہلِ وطن کی دیپ مالا کیا نرالی ہے

گُہر کے لعل کے یاقوت کے مالک ہزاروں ہیں
وطن کی آبرو کا کوئی وارث ہے نہ والی ہے

شرارت یہ کہ بھر لیں ہاتھ خونِ بے گناہاں سے
مصیبت یہ کہ دامانِ ہوس خالی کا خالی ہے

سروساماں ہمارا جز سیہ روزی نہیں کچھ بھی
یہی کملی ہے جو ہم بے نواؤں نے بچھالی ہے

گرایا قصرِ اُلفت کو تو ڈھایا کاخِ ملت کو
کہو اے اہلِ شر بنیادِ شر کیسی یہ ڈالی ہے

ابھی رُسوائیاں رخصت نہ مانگیں مٹنے والوں سے
ابھی کچھ اور بھی سر میں جنونِ پائے مالی ہے

ذکرِ الٰہی

یارب تری ہی ذات سراپا حیات ہے
فانی ہے ذرّہ ذرّہ مگر جاوداں ہے تُو

حُسنِ شہود غیب کے پردوں میں بند ہے
اتنا عیاں ہے تُو کہ سراسر نہاں ہے تُو

تیرا وجود معنیِ اسرارِ کائنات
رنگِ مجاز میں بھی حقیقت نشاں ہے تُو

وردِ زباں اگرچہ ہیں تیرے ہزار نام
حاصل یہ ہے کہ خالقِ ہر انس و جاں ہے تُو

تیرے کرم نے سب کو مکرّم بنا دیا
احسان مجھ پہ بھی کہ بہت ذوالمناں ہے تُو

مجھ سے کنارہ کش نہ رہے ساحلِ نجات
ہاں ناخدائے کشتیِ عمرِ رواں ہے تُو

سنہ ۱۹۳۱ء کی دیوالی

یا وہ منظر کہ تھی یہاں ہر روز
صبح ہولی تو شام دیوالی

یا یہ عالم کہ دیکھ کر انجام
کہتی ہے رام رام دیوالی

خدا کس جگہ نہیں

ہر اک مقام میں ہے جلوۂ خدائے غفور
کسی جگہ وہ نمایاں کسی جگہ مستور

اُسی کے حُسن سے تاباں ہوئے ہیں شمس و قمر
اُسی کے نُور سے روشن ہوا ہے شعلۂ طور

اُسی کے حُسن سے گلشن ہے غیرتِ فردوس
اُسی کے فیض سے ہر گُل ہے رشکِ پیکرِ حور

اُسی کی شانِ کرم کا ہے یہ کرشمۂ خاص
گناہ گار بھی رحمت پہ ہو گیا مغرور

اُسی کے مے کدۂ خاص کا ہے یہ احساں
ہر ایک آنکھ میں ہے بادۂ طرب کا سرور

اُسی کے حُسنِ عنایت سے ہے ملا آباد
اُسی کے جلوۂ رحمت سے ہے خلا معمور

غرض وہ روحِ مجرّد ہر ایک جسم میں ہے
ہر ایک ذرّے میں ہے اُس بسیطِ کُل کا ظہور

رخِ سحر کی ضیا میں بھی ہے وہ جلوہ فروز
شبِ سیاہ کی ظلمت میں بھی ہے وہ مستور

جو شرق و غرب میں دیکھو وہاں بھی ہے موجود
جو فوق و تحت میں دیکھو وہاں بھی ہے وہ ضرور

اگر نہیں تو امیروں کی محفلوں میں نہیں

جوشِ طلب

فقیروں کی سُن لے صدا ساقیا — سخاوت کے جوہر دکھا ساقیا
صراحی نہ ہم سے چھپا ساقیا — یہ روپوشیں کرنا ہے کیا ساقیا
لگی ہے جو دل میں بجھا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا

یہ دامانِ صحنِ چمن پُر نگار — یہ گُل ہائے تر کا رخِ آب دار
یہ سبزہ یہ گلشن یہ فصلِ بہار — یہ جھولے کا سایہ لبِ جوئبار
یہ ساون کی ٹھنڈی ہوا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا

خدا کے لئے بُخل اتنا نہ کر — رُکھائی کی باتیں زیادہ نہ کر
سخی ہے تو سائل سے جھگڑا نہ کر — یہ شوخی یہ تکرارِ بے جا نہ کر
مسافر نوازی دکھا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا

زمانہ کوئی گُل کھلانے کو ہے — خزاں باغِ ہستی میں آنے کو ہے

قضا اپنا خنجر دکھانے کو ہے　　　فلک ایک بجلی گرانے کو ہے
توقّف نہیں اب روا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا

تکلّف کی رندوں کو عادت نہیں　　　لوازم کی چنداں ضرورت نہیں
بجز مے کسی شے کی حسرت نہیں　　　ہمیں جامِ زرّیں کی حاجت نہیں
ان آنکھوں کو ساغر بنا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا

زمانے کا رہوار گردش میں ہے　　　ستاروں کا بازار گردش میں ہے
قلم ہے کہ پرکار گردش میں ہے　　　تری چشمِ سرشار گردش میں ہے
پیالہ بھی گردش میں لا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا

بہارِ جوانی کا ایما یہ ہے　　　نمودِ سحر کا تقاضا یہ ہے
ہر اک تشنہ لب کی تمنا یہ ہے　　　ہر اک موجِ مے کا تقاضا یہ ہے
فقیروں کی سن لے صدا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا

کرشن کا پیغام یاد نہیں آتا

ہم کو ساون کی گھٹائیں یاد ہیں　　باغ کی ٹھنڈی ہوائیں یاد ہیں
بادہ نوشوں کی صدائیں یاد ہیں　　حسن والوں کی ادائیں یاد ہیں
کرشن کا پیغام یاد آتا نہیں

عشرتِ بہرام سب کو یاد ہے　　ساقیٔ گل فام سب کو یاد ہے
اپنا اپنا جام سب کو یاد ہے　　دُختِ رز کا نام سب کو یاد ہے
کرشن کا پیغام یاد آتا نہیں

غیر کے الزام ہم کو یاد ہیں　　دشمنوں کے نام ہم کو یاد ہیں
رنج غم آلام ہم کو یاد ہیں　　عمر بھر کے کام ہم کو یاد ہیں
کرشن کا پیغام یاد آتا نہیں

دوستوں کی تُرش زبانی یاد ہے　　دشمنوں کی بدگمانی یاد ہے
حسن کی نامہربانی یاد ہے　　عشق کی ساری کہانی یاد ہے
کرشن کا پیغام یاد آتا نہیں

وصل کے دل کش ترانے یاد ہیں ہجر کے خونیں فسانے یاد ہیں
عشق و اُلفت کے فسانے یاد ہیں تیرِ مژگاں کے نشانے یاد ہیں

کرشن کا پیغام یاد آتا نہیں

آگ پانی میں لگانا یاد ہے جھوٹ کو سچ کر دکھانا یاد ہے
سوتے فتنوں کو جگانا یاد ہے بے کسوں پر حشر ڈھانا یاد ہے

کرشن کا پیغام یاد آتا نہیں

غریبوں کی دُنیا

کڑی دھوپ میں شامِ عشرت نہ ڈھونڈو شبِ غم میں نورِ مسرت نہ ڈھونڈو
جہنم کی آنچوں میں جنت نہ ڈھونڈو نحوست کے گھر میں سعادت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو!
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کے گھر میں مسرت بھی غم ہے غریبوں کے ساغر میں امرت بھی سم ہے
غریبوں کی گردن ہے تیغِ ستم ہے غریبوں کی ہستی نہیں اک عدم ہے

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

خطا ہو کسی کی گرفتار یہ ہیں
قصور اور کا ہو گنہ گار یہ ہیں

شفا جن سے بھاگے وہ بیمار یہ ہیں
نہیں جن کا چارہ وہ لاچار یہ ہیں

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

رہیں بند ان پر مروّت کی راہیں
وفا کو نبا ہیں تو کیوں کر نبا ہیں

ہمیشہ فلک پر رہیں ان کی نگاہیں
قیامت کے نالے قیامت کی آہیں

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کی لغزش سنبھلتے نہ دیکھی
قضا ان کی بالیں سے ٹلتے نہ دیکھی

کبھی پھانس غم کی نکلتے نہ دیکھی
کبھی نبض صحت سے چلتے نہ دیکھی

غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

مِصر کے اخبار نویس مہاتما گاندھی کے مزار پر

مرنے والے تری بالیں پہ عقیدت کے لئے
آئے ہیں مصر کے خطّے سے کچھ اخبار نویس

درس جو تُو نے اہنسا کا دیا تھا سب کو
کھینچ لائی ہے یہاں اُن کو اسی کی تقدیس

اس کو بھی رنگِ عقیدت کی نفاست کہئے
پیش کش کے لئے یہ لائے ہیں گل ہائے نفیس

بے کسی ہم نہ کہیں گے تری تنہائی کو
اب بھی ہے ایک زمانہ ترا غم خوار و انیس

تیرے پیغام کے ہیں لفظ تصرّف سے بری
کوئی تقریب نہیں ان کی نہ کوئی تفریس

نکتہ داں ہیں یہ تری خاک ۶۲۱ کو سمجھے ہیں خطیب ۶۲۱
کیوں نہ ہو دونوں کے اعداد ہیں چھ سو اکیس

غم زدہ سے ہیں بتا دے انھیں کچھ رازِ حیات
ان کے آنسو نہیں یہ ہے ترے اشکوں کی فیس

آج پھر امن پسندوں کو ہے لاحق یہ خطر
امن کو پیس نہ ڈالیں جو اسے کہتے ہیں پیس

بھاگتے تھے تری تعلیم سے یوں فتنۂ و شر
جیسے لاحول سے ہو جائے گریزاں ابلیس

امنِ عالم کے لئے تجھ کو وہ سوجھے ہیں نکات
جن کو سمجھا تھا فلاطوں نہ ارسطاطالیس

بے تکلّف یہ اُتر جاتا ہے سب کے دل میں
تیرا پیغامِ محبت ہے کہ اک شعرِ سلیس

تُو وہ تھا حرفِ روی جس میں نہ تھی قیدِ ردیف
نہ کوئی شرط دخیل اس میں نہ بحثِ تاسیس

سب کو تسخیر کیا بے سر و ساماں رہ کر
تیری دُنیا میں کوئی فوج نہ کوئی پولیس

پا گئی تیری فنا عین بقا کا رُتبہ
کبھی فانی نہ کہیں گے تجھے خضر و ادریس

انسانیت ۔ سنہ ۱۹۵۰ء

راکھ کو سونا بنانے کا ہنر سیکھا تو کیا
زہر میں امرت دکھانے کا ہنر سیکھا تو کیا

نقش پانی پر بٹھانے کا ہنر سیکھا تو کیا　　　جونک پتھر میں لگانے کا ہنر سیکھا تو کیا

تُو کسی انسان سے انسان بننا سیکھ لے

زور ہے کچھ دستِ و بازو میں تو خوں خواری سیکھ　　　عقل رکھتا ہے تو مکاری و عیاری نہ سیکھ

پائے بندِ حرص ہو کر خود گرفتاری نہ سیکھ　　　مال و دولت کی ہوس میں چور بازاری نہ سیکھ

تُو کسی انسان سے انسان بننا سیکھ لے

رہ کے کالج میں اگر نسوانیت سیکھی تو کیا　　　جا کے صحرا میں اگر رہبانیت سیکھی تو کیا

تختِ زر پر بیٹھ کر خاقانیت سیکھی تو کیا　　　گلشنِ فردوس میں رضوانیت سیکھی تو کیا

تُو کسی انسان سے انسان بننا سیکھ لے

علم کی خاطر تری شب خیزیاں بے فائدہ　　　عقل کی اتنی جنوں انگیزیاں بے فائدہ

فہم کی ذہن و ذکا کی تیزیاں بے فائدہ　　　کاغذی پھولوں کی عنبر بیزیاں بے فائدہ

تُو کسی انسان سے انسان بننا سیکھ لے

آسمانوں پر گزرنے کا ہنر بے کار ہے　　　چاند میں جا کر ٹھہرنے کا ہنر بے کار ہے

قعرِ دریا میں اُترنے کا ہنر بے کار ہے　　　قعرِ دریا سے اُبھرنے کا ہنر بے کار ہے

تُو کسی انسان سے انسان بننا سیکھ لے

باغِ جنت کی تمنا کا ثمر بھی کچھ نہیں　　　آبِ حیواں کے لئے شوقِ سفر بھی کچھ نہیں

کیمیا بھی کچھ نہیں اکسیر گر بھی کچھ نہیں گنج قاروں جمع کرنے کا ہنر بھی کچھ نہیں
تُو کسی انسان سے انسان بنانا سیکھ لے

ابنائے وطن کا حالِ زار - اکتوبر ۱۹۳۷ء

دید کے قابل ہیں اہلِ ہند بھی ان کی بدحالی کا نقشہ دیکھیے
آیئے ہر نوجواں کے دوش پر تندرستی کا جنازا دیکھیے
بارشِ تیرِ حوادث دیکھ کر سخت جانوں کا کلیجا دیکھیے
دو قدم چلنا بہت دشوار ہے پائے آزادی کا پھندا دیکھیے
ہر جگہ تحریر میں تقریر میں ہندی و اُردو کا جھگڑا دیکھیے
جن کی عزت تھی دیارِ غیر میں ویسی ہی ہیں اُن کو رُسوا دیکھیے
دشمنی کی آگ سب کے دل میں ہے سوزِ پنہاں کا یہ جلوا دیکھیے
دشمنوں کی دشمنی کا ذکر کیا دوستوں کے جَورِ بے جا دیکھیے
ایک اک دل میں ہزاروں داغِ غم غم زدوں کی وہ بپ مالا دیکھیے

دیوالی - ۱۹۴۵ء

پھر زمانے میں مسرت کی فراوانی ہوئی پھر اماوس کی شبِ تاریک نورانی ہوئی
روح افزا پھر چراغاں کا نظارا ہو گیا پھر اندھیرے سے نکلنے کا اشارا ہو گیا

لکشمی دیوی کی پوجا چار سو ہونے لگی
سبز ہر شاخِ نہالِ آرزو ہونے لگی

سبز ہوتے ہی خیالی پھول پھل آنے لگے
ان کے دھوکے میں عزیز و بتندل آنے لگے

جھک گئی ہے لکشمی دیوی کے در پر ہر جبیں
لیکن آزادی کی دیوی کا کوئی طالب نہیں

زر پرستی کا جنوں اہلِ وطن کے سر میں ہے
جس کو دیکھو وہ اسی دُھن میں اسی چکر میں ہے

خواہشِ دولت گلے کا ہار بن کر رہ گئی
روگ بن کر رہ گئی آزار بن کر رہ گئی

کوئی سمجھائے انہیں دولت پرستی کا مآل
مایۂ عبرت ہے محکوموں کی ہستی کا مآل

اہلِ زنداں کو نہیں ہوتی امارت کی ہوس
بندۂ دولت نہیں ہوتے اسیرانِ قفس

خواہشِ زر ہائے بندی میں ہے فطرت کے خلاف
یہ تمنّا ہے سراسر عقل و عادت کے خلاف

ہمتِ عالی جب آزادی کا مژدہ لائے گی
لکشمی دیوی بھی گھر میں خود بہ خود آجائے گی

جب تک آزادی نہیں ملتی یہ پوجا ہے فضول
اپنی ناداری و بدحالی کا شکوہ ہے فضول

کھولئے تدبیر سے جو پیچ ہیں تقدیر کے
کیوں نہیں سنتے ہو نالے پاؤں کی زنجیر کے

مفلسی محکومیت کو چھوڑ کر جاتی نہیں
لکشمی گھر میں غلاموں کے کبھی آتی نہیں

آزادی کی جھوٹی تمنّا۔ سنہ ۱۹۴۵ء

ہر ایک سر میں بھری ہے ہوائے آزادی
یہی ہے سب کو تمنّا کہ آئے آزادی

ہر ایک بزم میں ہیں نعرہ ہائے آزادی
ہر ایک ساز ہے وقفِ نوائے آزادی

تلاش کرتے ہیں سب خاکِ پائے آزادی
عزیزِ خلق ہوئی کیمیائے آزادی

کوئی سُنے نہ سُنے سب کو دُھن اسی کی ہے
سرِ نیاز ہے اور التجائے آزادی

مرض وطن کو جو لاحق ہے وہ بھی ایسا ہے
کوئی دوا نہیں جس کی سوائے آزادی

ہر ایک لب پہ ہے اس بات کا گلہ بھی بہت
قبول کیوں نہیں ہوتی دعائے آزادی

بڑھانے کو تو بڑھائے ہیں سب نے دستِ طلب
مگر گرہ میں نہیں ہے بہائے آزادی

یہ آرزو ہے کہ جب ہم ہوں خوابِ راحت میں
ہمارے گھر میں کوئی پھینک جائے آزادی

نہ اتحاد نہ اُلفت نہ جذبۂ صادق
یہ این بساط ہے یہ ادّعائے آزادی

نہ ترکِ بغض و عداوت نہ ترکِ جنگ و جدل
فقط ہے فتنۂ و شر مدّعائے آزادی

کرم جو اپنے حریفوں پہ اہلِ شر نے کیا
کہے گا اُس کو زمانہ جفائے آزادی

یہ سرکشی یہ جہالت یہ ماتمِ تہذیب
یہی ہے جبر کا عالم تو وائے آزادی

ابلا کا جلال

تصویر میں ایک عورت تلوار ہاتھ میں لئے کھڑی ہے۔ غصّے میں اس کا چہرہ بھی

پرجلال ہے۔ اس کی تلوار پر خُون کی چھینٹیں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ نظم اسی تصویر کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔

تجھ کو زیبا تھا کہ ہوتی ساقیِ ساغر بہ دست
دیکھتا ہوں کیوں تجھے اے نازنیں خنجر بہ دست

اس قدر بھڑکا دیا کیا دل کی آہوں نے تجھے
یا نگاہِ بد سے دیکھا بد نگاہوں نے تجھے

کس مصیبت میں تجھے خوں ریز ہو جانا پڑا
کیوں تجھے اے نازنیں چنگیز ہو جانا پڑا

یہ غضب یہ قہر یہ غصّہ یہ ہیبت یہ جلال
شیر مردوں کو ترے آگے ٹھہرنا ہے محال

صنفِ نازک میں یہ جرأت آج تک دیکھی نہ تھی
یہ شجاعت یہ بسالت آج تک دیکھی نہ تھی

سُورماؤں میں جیالوں میں ترا چرچا ہے آج
آن پر مر مٹنے والوں میں ترا چرچا ہے آج

مشتعل چہرے سے روشن شانِ نسوانی تری
خُون کے چھینٹوں سے رنگیں پاک دامانی تری

حُسن پر غصّے کی سُرخی رنگ ہے تصویر میں
یا بھرے ہیں لعل تو نے دامنِ شمشیر میں

آدمی عزّت کی خاطر شعلہ خُو اتنا تو ہو
آبرو والوں کو پاسِ آبرو اتنا تو ہو

اپنی دُھن میں محو ہے تُو اس قدر اے مہ جبیں
ہوش کچھ سر سے دوپٹّے کے سرکنے کا نہیں

تیرے تیور کہہ رہے ہیں سامنے آئے کوئی
جب یہ عالم ہے تو کیوں کر تجھ کو سمجھائے کوئی

کیا خبر کس کس کی تُو نے ختم کر دی زندگی
ہے تری شمشیرِ بُرّاں خون کی پیاسی ابھی

سنگ دل اتنی نہ ہو مظلومیت اپنی نہ چھوڑ
حُسن کی دیوی ہے تو معصومیت اپنی نہ چھوڑ

دُعائیں

دعا یہ ہے کہ اہلِ ہند پر فضلِ الٰہی ہو
ہمیشہ کے لئے رخصت شبِ غم کی سیاہی ہو

دعا یہ ہے کہ ہو سیراب کشتِ آرزو سب کی
گھٹا ایسی برس جائے کہ بارانی بھی چاہی ہو

دعا یہ ہے کہ شر پیدا نہ ہو انسان کے دل میں
ہمیشہ خیر اندیشی ہمیشہ خیر خواہی ہو

دعا یہ ہے کہ ہم نسوانیت کے ہوں نہ شیدائی
ضرورت آ پڑے تو ہر جواں مردِ سپاہی ہو

دعا یہ ہے کہ جنگ آرائیاں نابود ہو جائیں
نہ آئے وہ قیامت جس میں دُنیا کی تباہی ہو

دعا یہ ہے کہ مٹ جائے خزاں کا خوف ہر دل سے
چمن ہو پھول ہوں ہم ہوں نسیمِ صبح گاہی ہو

دعا یہ ہے کہ ہم معصومیت کی آبرو رکھ لیں
زبانِ دار سے ثابت ہماری بے گناہی ہو

دعا یہ ہے کہ خوش حالی خدا سب کو عطا کر دے
اسی پر مہربانی بھی ہو جس پر کم نگاہی ہو

دعا یہ ہے کہ آقا ہوں مربّی اپنے بندوں کے
غریبوں پر فدا ہر وقت شانِ کج کلاہی ہو

ابھی ایک اور بھی میری دعائے جوش باقی ہے
وطن دشمن جو ہیں اُن کے مقدر میں تباہی ہو

شبِ غم بُری بلا ہے

کہوں سرگزشت کس سے مرا کون آشنا ہے
تری آنکھ پھر گئی ہے کہ زمانہ پھر گیا ہے

نہ کبھی کسی نے پُوچھا کہ تجھے یہ کیا ہوا ہے نہ کسی نے آ کے دیکھا کہ یہ کون رو رہا ہے

شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے

کبھی دل کو تھام لینا کبھی سوزِ غم میں جلنا کبھی آہ کا اُبھرنا کبھی آنسوؤں کا ڈھلنا
کبھی ہائے ہائے کرنا کبھی کروٹیں بدلنا کبھی دم گلے میں رُکنا کبھی نبض کا نہ چلنا

شبِ غم بری بلا ہے شبِ غم بری بلا ہے

وہ ہوئی ہے سرگرانی کہ حواس کھو رہی ہے وہ ہے بارِ غم کہ پتھر مری جان ڈھو رہی ہے
وہ ہے بے کسی کا عالم کہ اجل بھی سو رہی ہے فقط ایک شمعِ سوزاں مرے غم میں رو رہی ہے

شبِ غم بری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے

ہوئی جب سے سر پہ نازل کبھی اس نے منہ نہ موڑا وہ بپا کیا ہے فتنہ کہوں جس قدر وہ تھوڑا
نہ قرار دل میں چھوڑا نہ سکوں جگر میں چھوڑا وہ لہو پیا ہے اس نے رگِ جاں کو بھی نچوڑا

شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے

مرے غم سے تم حزیں ہو تو میں سچ کہوں گا تم سے کوئی بے وفا نہیں ہو تو میں سچ کہوں گا تم سے
مری بات دل نشیں ہو تو میں سچ کہوں گا تم سے مری بات کا یقیں ہو تو میں سچ کہوں گا تم سے

شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے

نہ اُٹھے کبھی یہ طوفاں یہ گھٹا کبھی نہ چھائے یہ کسی کی آئی بن کر نہ کسی کے سر پہ آئے

یہ دعا ہے جوشؔ میری کوئی لاکھ جی جلائے
مگر اس طرح کی آفت نہ خدا کبھی دکھائے

شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بڑی بلا ہے

سلام

لو آ گئے عباس دلاور لبِ دریا
لو تیغ عدو رہ گئی کٹ کر لبِ دریا

کہتے تھے ہر اک موج کے تیور لبِ دریا
طوفان اُٹھائیں نہ ستمگر لبِ دریا

پانی بھی کسی کو نہ دیا اہلِ ستم نے
پیاسے تھے بہتر کے بہتر لبِ دریا

گرداب بھی اعدا سے یہ کہتے تھے بہ آواز
چلتا ہے یہ تقدیر کا چکر لبِ دریا

کیا تشنگیِ شوقِ شہادت تھی کہ عباس
پیاسے ہی پلٹ آئے پہنچ کر لبِ دریا

دشمن کی صفیں درہم و برہم تھیں کچھ ایسی
شبیر پہنچ جاتے تھے اکثر لبِ دریا

اس غم سے کہ بچوں کو بھی ملتا نہیں پانی
رہ جاتی تھی ہر موج تڑپ کر لبِ دریا

اک سمت فقط چند نفوس اور وہ پیاسے
اک سمت ہزاروں کا یہ لشکر لبِ دریا

وہ سرد مزاجوں کے مظالم سرِ میداں
وہ گرمیِ ہنگامۂ محشر لبِ دریا

مشکیزہ لئے آب علم دار کی رُو داد
کچھ بر لبِ سوفار ہے کچھ بر لبِ دریا

کس دل سے سُنے ان کی مصیبت کوئی اے جوشؔ
پیاسے ہی جو مر جائیں تڑپ کر لبِ دریا

تندرستی

تندرستی کو مقدم مانئے ——— زندگی کی جان اس کو جانئے
اس سے بہتر ایک بھی نعمت نہیں ——— اس کے پلّے کی کوئی دولت نہیں
اپنی صحت کی جسے پروا نہ ہو ——— وہ مسیحا سے کبھی اچھا نہ ہو
پادشہ کی شان و شوکت اک طرف ——— ایک بے ساماں کی صحت اک طرف
قدر اس کی پوچھئے بیمار سے ——— موت اچھی روز کے آزار سے
مایۂ لطفِ جوانی اس سے ہے ——— کیا جوانی زندگانی اس سے ہے
روحِ عالم جانِ آدم ہے یہی ——— نسخۂ اکسیرِ اعظم ہے یہی
غم کبھی صحت کے پاس آتا نہیں ——— اس چمن کا پھول مرجھاتا نہیں
اپنی صحت پر فدا دل کیجئے ——— جس طرح ہو اس کو حاصل کیجئے

تندرست • بچہ

(ایک ریڈ کراس پوسٹر کے لئے)

دیکھنا اس طفلِ خوش رو کو ذرا ——— کس قدر پیارا ہے کتنا دل ربا
سادگی اور اس پہ یہ زیبائیاں ——— کم سنی اور اس پہ یہ رعنائیاں

چُست ہے چالاک ہے طرّار ہے ― تن درستی کا علم بردار ہے
گول چہرہ نور کا سرمایہ دار ― سُرخ ہونٹوں پر تبسّم کی بہار
دست و بازو پہ توانائی فدا ― سارے اعضا پیکرِ نشو و نما
مسکراتے حسن کی تصویر ہے ― جلتی پھرتی شمعِ پرُ تنویر ہے
صاف ہے دامن گریباں آستیں ― ایک دھبا بھی نظر آتا نہیں
میلے پن سے کد اسے نفرت اسے ― روز مرہ غسل کی عادت اسے

خواب سے بیدار جب ہوتا ہے یہ ― سب سے پہلے ہاتھ مُنہ دھوتا ہے یہ
اس کی آنکھوں سے شجاعت آشکار ― شادمانی اس کی صحت پر نثار
کھیلتا ہے کھیل میں گاتا بھی ہے ― نغمۂ شیریں پہ اِتراتا بھی ہے
کام کرنا ہو تو مچلاتا نہیں ― کوئی مشکل ہو تو گھبراتا نہیں
شوق صادق اس کی جرأت پر فدا ― عزمِ محکم اس کی ہمت پر فدا

اے کمالِ شانِ طفلی زندہ باش
زندہ باش اے جانِ طفلی زندہ باش

بسنت (نغمۂ شیریں)

بہارِ صبحِ دل کشا بسنت بن کے آگئی ― نمودِ حسن کی گھٹا سرور بن کے چھا گئی

نصیب صحنِ باغ کا جو سو رہا تھا سو چکا / خزاں کا جور ہو چکا خزاں کا دور ہو چکا

اب اپنے حسن پر فدا شجر بھی ہے حجر بھی ہے / کمالِ شانِ دلبری اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے

نگاہِ شوق آج پھر دلِ پُر آرزو ہوئی / رہینِ سیرِ گُل ہوئی فدائے رنگ و بُو ہوئی

پھر آج رنگِ نسترن نظر نواز ہو گیا / پھر آج برگِ یاسمن حریمِ ناز ہو گیا

غبارِ خستہ خاطری کسی کے رُخ پہ اب نہیں / گرہ جو غم کی دل میں تھی وہ آج مہرِ لب نہیں

چمن کی شاخ شاخ پر طیور نغمہ زن ہوئے / یہ نغمے حسن بن گئے فروغِ انجمن ہوئے

ہر ایک شے میں زندگی ادائے ناز ہو گئی / شگفتگی میں تازگی کرشمہ ساز ہو گئی

نہ اب جنوں کی شدتیں نہ اب وہ ہرزہ گردیاں / ہوا میں اعتدال ہے نہ گرمیاں نہ سردیاں

صنم کدے سے برہمن جو ہو کے بے قرار اُٹھا / بہار سبزہ دیکھ کر ہری ہری پکار اُٹھا

نظر کا ذوقِ جستجو چمن میں خندہ زن ہوا / یہ خندہ رنگ بن گیا گلوں کا پیرہن ہوا

ہر ایک گل ہے باغ میں عروجِ شانِ ارتقا / زمینِ گلستاں ہے یہ کہ آسمانِ ارتقا

حیاتِ تازہ مل گئی تمام کائنات کو

طیور کو ہوام کو جماد کو نبات کو

بہادر کی زندگی

بہادر خلق میں وجہِ نشاطِ کامرانی ہے / اسی کے پردۂ ہمت میں پنہاں شادمانی ہے

اسی کی زندگانی حاصلِ دُنیائے فانی ہے — اسی کی مرگ کا اک نام عمرِ جاودانی ہے

چراغِ راہِ بے کس جلوۂ تاباں اسی کا ہے
دلِ افگاروں کی جنت گوشۂ داماں اسی کا ہے

اسی کا خون بن کر رنگ چمکا لالہ زاروں میں — اسی کا حوصلہ پھیلا ہے یوں بن کر بہاروں میں
اسی کا نام ہے حرفِ تسلی سوگ واروں میں — سکوں ہے بے قراروں میں تو مرہم دل فگاروں میں

اسی کے اشکِ چشمِ تر گہر بن کر برستے ہیں
اسی کی تیغِ خوں آشام سے جوہر برستے ہیں

اسی کے نام کا ہوتا ہے چرچا شہسواروں میں — اسی کے کام کا رہتا ہے شہرہ نامداروں میں
اسی کے نعرۂ ہیبت کا غل ہے آبشاروں میں — اسی کا شورِ یارب گونجتا ہے کوہساروں میں

اسی کے ناخنِ تدبیر کو تقدیر کہتے ہیں
وہ ہے گردِ نگہ اس کی جسے اکسیر کہتے ہیں

تنِ دشمن پہ لرزہ اس سے طاری ہو ہی جاتا ہے — بد اندیشِ سبک سر پر یہ بھاری ہو ہی جاتا ہے
نگاہِ خشم گیں کا زہر ساری ہو ہی جاتا ہے — ستم گر آہنیں جوشن میں عاری ہو ہی جاتا ہے

بہادر ہی کی ہستی سے فنا کو ہے بقا حاصل
بہادر جو نہیں اے جوشؔ جینا اس کا لاحاصل

گرم گفتاری - جون ۱۹۱۸ء

آج کل گرمی کی ہے رفتار گرم — ہر طرف ہے حشر کا بازار گرم
تابشِ گل سے ہے کچھ گلزار گرم — کچھ فغانِ عندلیبِ زار گرم
آتا ہے کھنچ کھنچ کے خلقت کا ہجوم — برف والوں کا ہوا بازار گرم
دم نکلتے ہی عدم کی راہ لی — ٹھنڈا ہو کر ہو گیا بیمار گرم
دوستوں کی سرد مہری دیکھ کر — اشک نکلے آنکھ سے دو چار گرم
عمر کو دم بھر نہیں ہوتا قیام — رات دن رہتا ہے یہ رہوار گرم
جل گیا جی شعلۂ آواز سے — حضرتِ واعظ کی ہے گفتار گرم
ٹھنڈی آہیں ہیں یہ کچھ آتش نہیں — آپ اتنے کیوں ہوئے سرکار گرم
سر میں سودائے دوئی دل میں بخار — ہے مزاجِ کافر و دیندار گرم
ملنے والوں سے ملا جاتا نہیں — ہو گیا کیا شربتِ دیدار گرم

جوشؔ یہ مصرع پسند آیا مجھے
آج کل گرمی کی ہے رفتار گرم

جیب جی صاحب کی شان میں

جیب جی صاحب کی ثنا کیا کہیے — بند کوزے ہی میں دریا کہیے

کیوں جمالِ گلِ رعنا کہئے
کیوں بہارِ چمن آرا کہئے

اس میں یہ اوج یہ عظمت ہے کہاں
کیوں اسے نظمِ ثریا کہئے

زندگی بخش ہے اس کا ہر شبد
اس لئے اس کو مسیحا کہئے

یہ بھی تعریف مکمل نہ ہوئی
وصف کہئے بھی تو پورا کہئے

گورو نانک کی زبانی اے جوش
اس کو پیغام خدا کا کہئے

ایک تاریخی واقعہ

ایک بے کس پیرزن کا نوجواں لختِ جگر
سرحدِ غزنی میں تھا اک کارواں کا ہم سفر

تنگ وادی میں گزرتے تھے کہ رہزن آ گئے
بن کے اک ابرِ بلا اس کارواں پر چھا گئے

قتل پر باندھی کمر غارت گری کی ٹھان لی
بیسیوں کا مال لوٹا بیسیوں کی جان لی

موت کا منظر غریبوں کو دکھا کر چل دیئے
لوٹ کا جو مال ہاتھ آیا اُٹھا کر چل دیئے

نوجواں کی بھی متاعِ زندگانی لٹ گئی
کارواں کے ساتھ گویا پیرزن بھی لٹ گئی

یہ خبر سنتے ہی بے کس پر گری برقِ بلا
خرمنِ صبر و تحمل راکھ بن کر رہ گیا

بن گئی دم پر جب اس آلام اس آزار میں
گھر سے نکلی آ گئی محمود کے دربار میں

روئی بیٹی آہ کی نالے کئے فریاد کی
کہ سنائی داستاں اس ظلم اس بے داد کی

سن چکا محمود تو کہنے لگا اے پیرزن
دور کے ملکوں کا بندوبست ہوتا ہے کٹھن

یہ جواب خشک سن کر بندھ گیا اشکوں کا تار
خوب روئی اور پھر کہنے لگی اے تاج دار

دور کے ملکوں کا بندوبست جب ممکن نہیں
جب وہاں کے امن و آسائش کا تو ضامن نہیں

جب کسی مظلوم کی امداد کر سکتا نہیں
جب کسی ناشاد کو تو شاد کر سکتا نہیں

رہزنوں سے جب رعایا کو بچا سکتا نہیں
امن کا جب ملک میں سکّہ بٹھا سکتا نہیں

جب غریبوں کی حمایت تجھ سے ہو سکتی نہیں
غم زدوں پر جب عنایت تجھ سے ہو سکتی نہیں

جب کسی بے کس کی تو فریاد سن سکتا نہیں
جب کسی کا شکوۂ بے داد سن سکتا نہیں

جب مسافر کی نگہ بانی تو کر سکتا نہیں
تو نے اتنی سلطنت کو کیوں کیا زیرِ نگیں

چند سڑکوں کی حفاظت بھی نہ جب تو کر سکا
پھر نمایہ تاجِ شاہی کس مرض کی ہے دوا

رباعیات

جو مشاعرہ یومِ چکبست میں پڑھی گئیں

روشن ہے پسِ مرگ بھی نامِ چکبست
انوار بنی ہوئی ہے شامِ چکبست

کیوں شمع کی فکر میں ہیں اہلِ محفل
جب شمع سے کم نہیں کلامِ چکبست

پُر ہے مئے زندگی سے جامِ چکبست
خم خانۂ معنی ہے مقامِ چکبست

جس نے بھی سنا اسے ہوا مستِ سخن
پیغامِ سرور ہے کلامِ چکبست

تیرے پیمانۂ دل میں وہ بھرا تھا امرت　　زالِ دنیا جسے پیتے ہی جواں ہو جائے

منجمد قوم کو تُو نے وہ روانی بخشی　　جس کے مذکور سے ہر نظم رواں ہو جائے

آہ پھر قوم ہوئی جاتی ہے بیگانۂ ہوش　　کیوں نہ ہر نالۂ غم برقِ تپاں ہو جائے

معبدوں کا بھی تو اب پاسِ تقدس نہ رہا　　کیوں نہ ہر نغمۂ ناقوس فغاں ہو جائے

آج پھر باغِ وطن خشک نظر آتا ہے　　پھر وہی ابرِ کرم فیض رساں ہو جائے

تیرے ہاتھوں نے یہ سینچا تھا جڑے اس کی　　کہیں ایسا نہ ہو پامالِ خزاں ہو جائے

خشک سالی - ۱۹۱۵ء

رونے والوں پہ نہ رویا بادل　　سمجھا رونے کو تماشا بادل

پانی ہو کر نہ پسیجا بادل　　صورتِ برق نہ تڑپا بادل

رات دن غم میں لہو روتے ہیں　　آنکھ اپنی ہے رنگیلا بادل

ہاتھ ملتے ہیں شجر کے پتے　　بگڑا جاتا نہیں اڑتا بادل

اوپر اوپر ہی نکل جاتا ہے　　سر پہ بادل ہی کے برسا بادل

کس قدر کشتِ فلک ہے سرسبز — اوپر اوپر کہیں برسا بادل
دلِ حسرت زدہ کیوں بیٹھ نہ جائے — درد بن کر بھی نہ اُٹھا بادل
چادرِ آبِ رواں رکھتا تھا — خوب اسے اوڑھ کے سویا بادل
آج ساون کا مہینا بھی ہے ختم — ایک دن بھی تو نہ برسا بادل
تشنہ کامی کی کوئی حد یارب — پھرتا ہے پیاس کا مارا بادل

جھولتے کاش کھموں سے جھولے — یوں نہ بانوں میں جھلاتا بادل
اُس اداسی کی طرح چھا جاتا — رنگ بن بن کے نہ اڑتا بادل
باندھتا اپنی ہوا عالم میں — کرتا پچھوا کی نہ پروا بادل
شور و غوغا کی ضرورت کیا تھی — خندۂ برق پہ روتا بادل
گھوم کر رقص دکھاتے طاؤس — جھوم کر سر پہ جو آتا بادل
تیرہ و تار گھٹا چھا جاتی — کرتا عالم میں اُجالا بادل

تر ہو اے جوشؔ زمیں شعر کی بھی
کاش برسے کوئی ایسا بادل

بادل آئے

جام پر جام لنڈھاتے ہوئے بادل آئے
پینے والوں کو پلاتے ہوئے بادل آئے

رہ گئی بزمِ جہاں چشمِ تماشا بن کر
کس قدر دھوم مچاتے ہوئے بادل آئے

جم گئی بزمِ طرب ساز ہے فطرت کا درست
تان پر تان اڑاتے ہوئے بادل آئے

برق وش کون ہے وہ جس کا ہے پردہ منظور
ایک محمل سا بناتے ہوئے بادل آئے

زندگی ہر تنِ بے جاں کو ہوئی ہے حاصل
اپنا اعجاز دکھاتے ہوئے بادل آئے

کس تکلف سے کیا بزمِ طرب کا ساماں
فرش مخمل کا بچھاتے ہوئے بادل آئے

کیا مرے دستِ جنوں کا ہے انہیں بھی شکوہ
چاک دامن کا دکھاتے ہوئے بادل آئے

رحمتِ خاص کا اعلان پھر اس زور کے ساتھ
آسماں سر پہ اٹھاتے ہوئے بادل آئے

واہ کیا جوشِ کرم ہے کہ خزانہ اپنا
دونوں ہاتھوں سے لٹاتے ہوئے بادل آئے

دعا۔ اسکولوں کے لئے (۱۹۴۸ء)

مرے داتا مری بگڑی کو بنانے والے
مجھ کو ہر ایک مصیبت سے چھڑانے والے

ایک میرا ہی نہیں سب کا سہارا تو ہے
دردمندوں کے ہر اک درد کا چارا تو ہے

لوک پرلوک میں تجھ سا نہیں داتا کوئی — تیرے دربار سے خالی نہیں جاتا کوئی

اتنی شکتی مرے بازو میں تو پیدا کر دے — جھنڈا بھارت کا ہمالہ سے جو اونچا کر دے

میں غریبوں کے ہر اک دکھ کی دوا ہو جاؤں — یعنی دوزخ میں بھی جنت کی ہوا ہو جاؤں

گیان کی جوت سے گھر گھر میں اُجالا کر دوں — وطن کی شان زیادہ سے زیادہ کر دوں

کوئی تفریق مرے دل میں نہ رہنے پائے — ہر جگہ دھرم مرا پریم کا مینہ برسائے

دل سے نکلی ہوئی سن لے یہ صدائیں میری
تیری رحمت کو ترستی ہیں دعائیں میری

قومی جھنڈا

تفریق مٹا کر ہمیں یک رنگ بنا دے — بھارت میں کچھ اس رنگ سے لہرائے ترنگا

وہ حسنِ قبول اس کو الٰہی تو عطا کر — دشمن کی بھی نظروں میں سما جائے ترنگا

مبارک یوم آزادی - سنہ ۱۹۴۸ء

ہزاروں ہی نہیں لاکھوں بشر اب تک ہیں فریادی — کئے جاتی ہے اپنا کام جلادوں کی جلادی

فغاں برلب ہے کشمیری تو نالاں حیدر آبادی — جدھر دیکھو نظر آتی ہے ناشادی ہی ناشادی

مگر پھر بھی کہو کھل کر مبارک یوم آزادی

ستم گاروں نے سب کو مضطرب احوال کر ڈالا — یہ سارے کا سارا نامۂ اعمال کر ڈالا
تدبّر کو سیاست کو پریشاں حال کر ڈالا — اِدھر کشمیر اُدھر پنجاب کو پامال کر ڈالا

مگر پھر بھی کہو مل کر مبارک یومِ آزادی

گرانی کی وہ شدت ہے کہ سب کا ناک میں دم ہے — جگر مجروح ہے دل مضطرب ہے آنکھ پُرنم ہے
یہ عالم ہے کہ ہر نغمہ صدائے شورِ ماتم ہے — مصیبت کہ رہی ہے تم پہ جو گزری بہت کم ہے

مگر پھر بھی کہو مل کر مبارک یومِ آزادی

اس آزادی کی اُلفت میں لہو رونا پڑا ہم کو — شہیدِ خنجرِ جور و جفا ہونا پڑا ہم کو
بیابانوں میں فرشِ خار پر سونا پڑا ہم کو — اثاثۂ عزت و ناموس کا کھونا پڑا ہم کو

مگر پھر بھی کہو مل کر مبارک یومِ آزادی

اس آزادی میں ہم نے لاکھ کے گھر خاک دیکھے ہیں — ہزاروں نازک اندا موں کے سینے چاک دیکھے ہیں
درندوں سے زیادہ آدمی سفاک دیکھے ہیں — وطن واری کے ان آنکھوں نے قصے پاک دیکھے ہیں

مگر پھر بھی کہو مل کر مبارک یومِ آزادی

داستانِ ایشیا

جنوری ۱۹۴۹ء ایشیائی ممالک کی ایک بین الاقوامی کانفرنس بہ مقام دہلی ایشیا کے مستقبل پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ یہ نظم اسی تقریب پر کہی گئی ہے

انجمن اقوامِ مشرق کی ہوئی ہے منعقد
آج دہلی کی زمیں ہے آسمانِ ایشیا

جامعیت دیکھنا اس مختصر تعداد کی
ہے نمائندوں کی محفل پر گمانِ ایشیا

راہِ آزادی میں اس کا خاص مقصد ہے یہی
اپنی منزل سے نہ بھٹکے کاروانِ ایشیا

بحث ہوتی ہے ولندیزوں کے استبداد پر
ایک مدت سے ہیں یہ نامہربانِ ایشیا

یہ بھی اُن زور آزماؤں کے شریکِ کار ہیں
جانچتے رہتے ہیں جو تاب و توانِ ایشیا

اس میں جو تقریر پہلے کی جواہر لال نے
بڑھ گئی اُس سے زمانے بھر میں شانِ ایشیا

انکسار اتنا پھر اس میں بھی یہ خودداری کا اَوج
آسماں سے کم نہیں ہے آستانِ ایشیا

تلخیٔ غم کا بیاں اور اس قدر شیرینیاں
مرحبا صد مرحبا اے ترجمانِ ایشیا

ہو گئی ہے ایشیا پر یہ حقیقت آشکار
اتحادِ باہمی ہے پاسبانِ ایشیا

بدگمانی کا محل ہے کون سا اس بحث پر
پُو چھتی ہے بدگمانوں سے زبانِ ایشیا

فہم بھی اس کو ملا ہے قوتِ ادراک بھی
کیوں نہ سوچے ایشیا سود و زیانِ ایشیا

انجمن اقوامِ عالم کی ہے اس سے مطمئن
رکنِ اعظم بھی ہے اس کا ہم زبانِ ایشیا

دردمندوں ہی کو ہے کچھ دردِ پنہاں کی خبر
ایشیا ہی کہہ سکے گا داستانِ ایشیا

امن کا انصاف کا دعوےٰ تو کرنا بعد میں
پہلے دل کو تھام کر سُن لو بیانِ ایشیا

کیوں جفا ہوتی ہے انڈونیشیا پر بار بار
تختۂ مشقِ جور کیوں ہر دم ہے جانِ ایشیا

کیوں حدیثِ دردِ دل ہے اس کے لب تک
اک جہانِ رنج و غم ہے کیوں جہانِ ایشیا

رات دن گرمِ سفر رہنے کا باعث ہے یہی
ڈھونڈتی ہے سُننے والوں کو فغانِ ایشیا

امنِ عالم کے پرستاروں سے پوچھا چاہیئے
تا بہ کے ہوتا رہے گا امتحانِ ایشیا

تا بہ کے تیغِ جفا کی آزمائش کے لئے
منتخب ہوتے رہیں گے ساکنانِ ایشیا

کُشت و خوں سے باز آئے پرستارانِ جنگ
بس یہی پیغام دیتی ہے زبانِ ایشیا

قطعہ

محبت کی جفا ہم نے فقط اتنی ہی دیکھی تھی
ہوئے تیغِ تغافل سے دلِ بے تاب کے ٹکڑے

سیاست کی مگر دہری جفاؤں سے تڑپتے ہیں
اُدھر بنگال کے ٹکڑے اِدھر پنجاب کے ٹکڑے